TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

آئینہ ہندوستان

REBEL INDIA کا اردو ترجمہ

مصنفہ

مسٹر ایچ۔ این۔ بریلسفورڈ

بفرمائش مسٹر لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب
لوہاری گیٹ لاہور

درسناتھ دی برہم آئیم پریس، پٹیالہ روڈ لاہور میں باہتمام بابو سوم پرکاش ساہنی،
پرنٹر و پبلشر چھپا

فہرست مضامین

دیباچہ

ہندوستان یورپین عینک سے

سال گذشتہ میں لندن کا ایک انگریز جرنلسٹ مسٹر ایچ۔ این بریلسفورڈ یہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرنے ہندوستان میں آیا۔ اور اس نے ہر ممکن ذریعہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ شہروں میں گیا۔ دیہات میں گشت لگایا۔ دیہاتیوں سے ملا۔ مزدوروں سے بات چیت کی۔ یرودا جیل میں مہاتما گاندھی سے ملنے گیا۔ اس نے ستیہ آگرہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھا۔ اور اپنے تمام مشاہدات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا۔ اسے کتابی صورت میں قلمبند کیا۔ ہم اس کی تصنیف کے چند اقتباسات اس کتاب میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ بعض حصے طوالت کے خیال سے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ناظرین پر واضح ہوگا۔ کہ اگر کوئی شخص کوشش کرے۔ تو ہندوستان کے صحیح حالات بھی جان سکتا ہے۔ مسٹر بریلسفورڈ

مہاتما گاندھی کی تحریک کو صحیح طور پر سمجھا۔ اور مہاتما جی سے تعلق بڑی
حد تک صحیح رائے قایم کی۔ اِس تصنیف سے یقیناً ہندوستان [illegible]
کو فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ ایک بے لاگ شخص نے ذاتی مشاہدات کی بنا پر رائے
قایم کرنے کے بعد واقعات کی درست تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اس
کتاب میں اول [illegible] تک کے حالات ہیں۔ دوسری [illegible]
میں بھی ہے۔ اور اس کے بعد ہندوستان [illegible]
اُس کا مصنف کو پہلے سے علم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے [illegible]
ہندوستان کو سوراج ملے۔ کیونکہ ہندوستان کے [illegible]
کے خیال میں اور کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن مصنف [illegible]
ذمہ دار زیادہ تر ہمارے رسم و رواج۔ ہمارے عقاید اور ہماری [illegible] اور
ہماری جہالت کو ٹھیرایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی تباہی کے بڑی
حد تک ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ [illegible] حکومت
نے ہمارے دماغوں کو اس حالت میں رکھا اور ہماری صنعت و حرفت کو
ترقی کرنے کے موقع بہم نہ پہنچائے اور دیہات میں علم کی روشنی پھیلانے میں
بے پرواہی کی کچھ ذمہ داری اس پر بھی عاید ہوتی ہے بہرحال حکمران قوم
کے ایک فرد سے جس قدر صاف بیانی کی توقع ہو سکتی تھی۔ جس صاف بیانی
سے کہ مسٹر بریلسفورڈ نے کام لیا ہے۔ [illegible] قدر قایل
نہیں کرتا۔ ہندو مسلم مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ جداگانہ نیابت کو آزاد ہندوستان
کے حق میں سب سے بڑی لعنت قرار دیتا ہے۔ مصنف نے ہر ایک رائے
نہایت دیانتداری سے قایم کی ہے۔ [illegible]
وجہ سے [illegible]

حلیمی اور منکسر المزاجی اور مسکینی کو ہندوستان کی غلامی کا اصلی سبب قرار دیا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ کہ اسی عادت کی وجہ سے باہر کے حملہ آور یہاں غلبہ حاصل کرتے رہے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ جو شخص ستیہ گرہیوں کے عدم تشدد کا مداح ہے۔ وہ کس طرح مسکینی اور حلیمی کی مذمت کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ فروگزاشت کہ اس وجہ سے ہے۔ کہ مصنف نے دوسرے حالات کے گردوپیش میں تربیت پائی ہے۔ اور اسکی قومی روایات ہم سے مختلف ہیں۔ لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ایک محقق کی نظر سے لکھا ہے۔ اس قدر ناقدانہ تفتیش کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جو سیاح بھی یورپ سے چند ہفتوں کے لئے ہندوستان میں آتا ہے۔ وہ اس ملک کے حالات کا ماہر ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ اور ایک کتاب لکھ کر شائع کرا دیتا ہے۔ حالانکہ اس نے بمبئی سے کلکتہ تک چند بڑے بڑے شہروں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ مسٹر بریلسفورڈ ایسے سیاحوں میں سے نہیں ہیں۔

پبلشرز

باب اوّل

ہندوستان نے گاندھی جی کی پیروی کیوں کی؟

ہندوستان میں آپنے حال کے دورہ کے متعلق جو یادداشتیں میں نے لکھی ہیں۔ ان میں ایک ایسے منظر کا ذکر آتا ہے جس سے مہاتما کی تحریک کا صحیح نظارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی شانتی ایک انگریز تماشائی کے لئے نہایت حیرت انگیز تھی۔ یہ واقعہ ایک چھوٹے سے قصبہ کا ہے۔ جو آگرہ کے قریب واقع ہے۔ اس جگہ کا نام فیروزآباد ہے۔ یہ ایک تجارتی قصبہ ہے۔ وہاں کے بازار میں اونٹ اور بیلوں کے چھکڑے دکھائی دیتے ہیں مگر انہیں کے درمیان سے موٹر لاریاں بھی گذرتی ہیں۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں کانچ کی چوڑیوں کی صنعت اوج کمال پر ہے۔ یہ چوڑیاں دیہاتی عورتوں کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اور یہی تجارت وہاں کے باشندوں کے لئے آمدنی کا ذریعہ ہے کاریگر ایک مٹی کی بھٹی کے سامنے بیٹھا ہوا مسلسل ۱۲ گھنٹے کام کرتا ہے

اِس عرصہ میں وہ کھانے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ پگھلے ہوئے کانچ کی چوڑیاں بنائے جاتا ہے۔ اور ایک کم سن لڑکا جس نے ۷ سال کی عمر میں ہی کام کرنا شروع کردیا ہوگا۔ اسکی مدد کرتا ہے۔ اِن میں کوئی بڈھا کاریگر نظر نہیں آیا۔ یہ پُرجوش چھوٹا سا قصبہ قوم پرستی کے جذبے سے بھی معمور ہے۔ ہندوستان کے تمام تجارتی شہروں میں یہی حالت پائی جاتی ہے۔ اُس کے بڑے بازار میں مَیں نے ایک عجیب جلوس دیکھا۔ کانگرس پارٹی کے دس آدمی دوکانوں پر پکٹنگ کرنے کے الزام میں جیل کو لے جائے جا رہے تھے۔ یہ پکٹنگ برطانوی مال کے بائیکاٹ کے سلسلے میں تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں اور وہ ایک رسی کے حلقے کے اندر چل رہے تھے۔ اُن کے پیچھے باقاعدہ قطاروں میں اُن کے ہمدردوں کا ایک ہجوم ساتھ ساتھ تھا۔ بعض کے ہاتھوں میں لاٹھیاں بھی تھیں۔ وہ سب کے سب غصّے کی حالت میں اور مشتعل تھے۔ دو ایک آواز ہوکر کانگرسی نعرے لگا رہے تھے۔ اور کبھی کبھی گیت گانے لگتے تھے۔ اُن کی تعداد سو یا اُس سے زیادہ تھی۔ آخر وہ کونسی طاقت تھی۔ جس نے انہیں تشدد سے روک رکھا تھا۔؟ میں نے شمار کیا۔ تو صرف چار ہندوستانی پولیس مین نظر آئے۔ جو اِن قیدیوں کو اپنی تحویل میں لے جا رہے تھے۔ اگر اِس قسم کا واقعہ میرے مغربی ملک میں ہوتا۔ اور یہ بات ہجوم کے علم میں ہوتی۔ کہ قریب سے قریب فوجی چھاؤنی وہاں سے تیس میل ہے۔ نیز یہ کہ ہر ایک ہموطن کی ہمدردی اُن کے ساتھ ہے۔ تو وہ لوگ ضرور اپنے دوستوں کو چھڑا کر لیجاتے۔ یہ نظارہ برِاعظم ہند کے منظر کا ایک دُھندلا سا خاکہ ہے۔ ہر جگہ یہی حالت تھی کہ لاکھوں آدمی جو جذبات سے لبریز تھے۔ پولیس کی مختصر سی طاقت کے سامنے جھک گئے۔ جو اُن کے متفقہ حملے کی ہرگز تاب لا سکتی تھی۔ معترضین نے

اِس حیرت انگیز ضبط و تحمل پر پردہ ڈالنے کی اِس طرح کوشش کی۔ کہ گاندھی کے پیروؤں کو انہوں نے انتہا پسند کے نام سے نامزد کیا۔ یہ لفظ نہایت ہی گمراہ کن ہے۔ کیونکہ اِس کے یہ معنے ہوئے۔ کہ یہ ایک اقلیت جماعت ہے۔ جس کے خیالات حد سے زیادہ بیباک ہیں۔ کانگرس والے خواہ کتنے ہی ضدی ہوں لیکن وہ تشدد پسند نہیں ہیں۔ البتہ ایک انتہا پسند طبقہ نوجوانوں کا اور ہے۔ جو دہشت ناک افعال اور گوریلا جنگ کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ اور اب وہ صرف اِس انتظار میں ہیں۔ کہ عدم تشدد کی تحریک کی ناکامی تسلیم کر لی جائے۔ کانگرس ہرگز اقلیت میں نہیں ہے۔ بمبئی کے شمال میں تمام وسیع علاقے کی تمام ہندو آبادی کی ہمدردی کانگرس کو حاصل ہے۔ اور شہروں کی نسبت دیہات میں کانگرس کے ساتھ کچھ کم ہمدردی نہیں ہے۔ اُس کے چند نکتہ چینوں کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کا حکم رکھتی ہے۔

مسلم اقلیت بطور ایک منظم جماعت کے کانگرس سے ضرور علیحدہ ہے لیکن قدامت پسند مسلم لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔ کہ مسلمان نہ کانگرس کے مخالف ہیں۔ نہ گورنمنٹ کے حامی۔ اور نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان تو تمام و کمال کانگرس کے ساتھ ہیں۔ بمبئی کے ایک پولیس انسپکٹر نے تخمینہ کیا۔ کہ حامی کانگرس مسلمان مسلم آبادی کا ایک تہائی حصہ ہیں۔ چھ مسلمان بیرسٹروں سے میری بات چیت ہوئی۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ مسلمانوں کی نصف آبادی کانگرس کے ساتھ ہے۔ اگرچہ وہ جیل کی سختی برداشت کرنے پر کم مائل ہیں۔ اور مہاتما گاندھی کے زیادہ عقیدتمند نہیں۔ لیکن وہ شمالی ہند کے زیادہ سرگرم باشندوں کی تمناؤں سے یقینی طور پر ہمدردی رکھتے ہیں۔

اگر کانگرس الیکشن میں حصہ لینا چاہے۔ تو تمام جنوبی ہند میں دوسرے

تمام اُمیدواروں کو وہ شکست دے سکتی ہے۔ اِس سال کے ایجیٹیشن میں ہندوستان کی تمام زندگی میں کانگرس کا اثر ہر جگہ نمایاں رہا ہے۔ اور کوئی شخص اِسے فراموش نہیں کر سکتا۔ کہ بازاروں سے جو موٹر کاریں گذرتی ہیں ان پر کانگرس کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ بچے کانگرس کے گیت گاتے ہیں تجارت کانگرس کے حکم کے مطابق ہوتی ہے۔ بمبئی والوں نے دیکھ لیا۔ کہ وہاں دو گورنمنٹیں ہیں۔ اگرچہ یورپین آبادی برٹش گورنمنٹ کی ابھی تک وفادار ہے۔ جو قانون اور طاقت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ ہندوستانی سپاہی جو سرکاری وردی پہنتے ہیں۔ اور مسلم اقلیت کے بڑی عمر کے آدمی سب مطیع سرکار ہیں۔ لیکن باقی تمام بمبئی نے شہنشاہ معظم کے بیشمار قیدیوں میں سے ایک قیدی کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ کانگرس مہاتما گاندھی کے نام پر اِس شہر پر حکومت کر رہی ہے۔ کانگرس کے ذرا سے اشارے کی فوراً تعمیل ہوتی ہے۔ جب اُس کی مرضی ہو۔ بازاروں میں لاکھوں مرد اور عورتیں جمع ہو جاتے ہیں۔ جو کانگرسی نعرے لگاتے ہیں۔ اُس کے ایک حکم پر جبکہ وہ ہڑتال کا اعلان کرے۔ بازاروں میں تمام دوکانوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے خلاف اظہار ناراضگی کے طور پر وہ تقریباً ہر ہفتے ہڑتال کراتی ہے۔ بازاروں میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ کارخانے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ایک رنگریز یا تاجر کانگرس کے چھپے ہوئے اجازت نامے بغیر کوئی چھکڑے والا اپنے بیلوں کو نہیں ہانک سکتا۔ اور نہ کانگرس کے والنٹیر کو دکھلائے بغیر اپنا مال اُتار سکتا ہے۔ کیونکہ ہر جگہ کانگرس سنتری پہرا دے کے پہرے لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے انسپکٹر ہر ایک گودام اور دوکان میں داخل ہوتے ہیں اور ہر ایک روئی کے پریس پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ بدیشی مال کو ضبط بھی کر لیتے ہیں

ایک سوداگر نے بدیشی مال والنٹیروں کی نظر سے بچا کر لیجانا چاہا تھا۔ مدت تک ہر روز اُس کی مذمت کی گئی۔ اور تمام شہر نے دُعا مانگی اور گیت گائے۔ ہر ایک محلے سے طلوعِ آفتاب پر بلکہ اُس کے قبل پربھات پھیری کا ایک چھوٹا سا جلوس نکلتا ہے۔ یہ لوگ سب سفید لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جو ہاتھ کے کاتے ہوئے کھدر کا بنا ہوتا ہے۔ جو اِس بات کا نشان ہے۔ کہ ہندوستان نے اپنی ضرورتوں کو خود مہیا کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ مردوں کے سروں پر گاندھی ٹوپی ہوتی ہے۔ اور بعض کے سر پر پگڑی۔ اور سب گیت گاتے ہیں۔ تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اِس تحریک کے اخبارات انگریزی میں نکلتے ہیں لیکن بہت سے ورنیکلر اخبارات اُن لوگوں کے لئے ہیں۔ جو صرف اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بالکل ناخواندہ ہیں۔ اُنہیں بہت سے کانگرسی گیت اور ترانے اور بھجن زبانی یاد ہیں۔ جن میں تحریک کے لیڈر کی مدح و ثنا ہوتی ہے۔ برطانوی مال کے بائیکاٹ کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔ اور آزادی حاصل کرنے یا مر جانے کا پرن کیا جاتا ہے۔ اِن چھوٹے چھوٹے جلوسوں میں دس دس بارہ بارہ آدمی شامل ہوتے ہیں۔ بعض میں مرد۔ بعض میں بچے اور بعض میں عورتیں ہوتی ہیں۔ یہ گیت روزانہ زندگی کا منتر ہیں۔ تم اُنہیں سُنے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تم انہیں فراموش نہیں کر سکتے۔ ہر شخص نے دفتر میں یا دوکان میں داخل ہونے سے پہلے یہ گیت ضرور سُنے ہیں۔ اگر کوئی انگریز افسر موٹر کار میں جا رہا ہو۔ تو اُس کے پیچھے پیچھے بھی یہ لوگ گیت گاتے ہوئے چلتے ہیں۔

بمبئی کی یہ حالت تحریک کے ابتدائی حصے میں تھی۔ ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء کے آخر میں کئی ایک سخت آرڈیننس جاری ہوئے۔ کانگرس کو مجمع خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ اُن کی تمام عمارتیں۔ اور جایئداد منقولہ کی ضبطی کا حکم دیا گیا۔ کانگرس

کی طرف سے جو جلسے کیئے جائیں۔ وہ سب خلافِ قانون قرار دیئے گئے۔ ان فرمانوں کی وجہ سے کانگرس ایک حد تک پوشیدہ طور پر کام کرتی رہی۔ بازاروں میں اس کا پہلا سا غلبہ نہ رہا۔ لیکن اس سے زیادہ تبدیلی نہ ہوئی جیسی کہ امید کیجاتی تھی۔ اس کے بلیٹن اب تک شایع ہوتے تھے۔ اور پوشیدہ طور پر مشینوں پر چھپتے۔ اور بازاروں میں تقسیم کیئے جاتے تھے۔ چند والنٹیر جلسے کے انعقاد کی اطلاع دیتے۔ بہت سے لوگ جلسے میں جمع ہو جاتے۔ اگرچہ جلسہ بعد میں منتشر کیا جاتا تھا۔

مقامی افسروں کے ذاتی مزاج کے تناسب سے سختی میں کمی بیشی ہوا کرتی تھی۔ صوبجات متحدہ میں تشدد نرمی کے ساتھ ہوا۔ میں نے الہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو کی کوٹھی پر ماہِ نومبر میں سہ رنگا جھنڈا نصب دیکھا۔ یہ کوٹھی کانگرس کا صدر مقام تھا۔ یہاں مقامی لیڈر اور دوسرے صوبوں کے بیدار آتے رہتے تھے۔ اور ان کو تنگ نہیں کیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں نرمی اور خوش مزاجی کی وجہ سے مقامی ایجی ٹیشن کمزور پڑ گیا تھا۔ میں نے ایک مجسٹریٹ کا ذکر سنا ہے۔ جو لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ جس نے قانونِ نمک کی خلاف ورزی کو نداق میں اڑا دیا۔ مقامی کانگرس لیڈروں نے اس کی کوٹھی کے سامنے کھلم کھلا نمک بنایا۔ وہ کوٹھی سے باہر نکل کر آیا۔ اور کچھ نمک خرید کر چکھا اور اس کے بدمزہ ہونے پر قہقہہ لگایا۔ اور لوگوں سے ہنسی دل لگی کی باتیں کر کے کوٹھی میں واپس چلا گیا۔ ہجوم منتشر ہو گیا۔ اور لوگوں نے دوبارہ نمک بنانے کا اقدام نہیں کیا۔ بخلاف اس کے جہاں کہیں غیر معمولی سختی سے کام لیا گیا۔ خاصکر جسمانی سزائیں سفاکی کے ساتھ دی گئیں۔ اس سے لوگوں کا غصہ بڑھ جاتا تھا۔ اور وہ زیادہ دلیری کے ساتھ مزید قربانیاں کرنے کے لیئے آمادہ ہو

جاتے تھے۔ البتہ آئندہ تشدد میں سختی نے تحریک کو دبا دیا تھا۔

جب دن گذرتے گئے۔ تو یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ یورپین بازاروں میں بھی بعض دوکانوں کے دروازوں پر ایک ایک دو دو ہندوستانی دیویاں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئیں۔ وہ سب ہندوستان کا خوشنما لباس پہنے ہوئے تھیں۔ مگر ان کی ساڑھیاں کیسری رنگ کی تھیں۔ اس رنگ کے ساتھ اس ملک میں تاریخی روایات وابستہ ہیں۔ ان دوکانوں پر بہت کم گاہک آتے تھے۔ دوکانوں کے مالک یا مطالعہ میں مصروف رہتے یا شطرنج کھیلا کرتے۔ لیکن اگر کوئی گاہک دوکان میں داخل ہونے کا قصد کرتا۔ تو لیڈی دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کرتی۔ کہ وہ بدیشی مال نہ خریدے۔ لیکن اگر وہ کسی طرح باز نہ آتا۔ تو وہ دروازے کے سامنے لیٹ جاتی۔ ایک دفعہ چند عورتیں ایک موٹر کار کے سامنے لیٹ گئیں آخر یورپین لیڈی کو جس نے بدیشی مال خریدا تھا۔ دوکاندار کو واپس کرنا پڑا۔ لیکن ایسی دوکانیں بہت کم تھیں۔ جنہوں نے بدیشی کپڑا یا برطانوی مال فروخت نہ کرنے کا عہد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اکثر ہندوستانی دوکانوں نے اقرارنامے لکھ دیئے تھے۔ اور جہاں کہیں پکٹ لگے ہوتے تھے۔ وہاں تو ایسا شاذ و نادر واقع ہوا ہے۔ کہ کسی ہندوستانی گاہک نے ان کا کہنا نہ مانا ہو۔ پکٹنگ کرنے والے سینکڑوں کی تعداد میں جیل کو گئے۔ لیکن ان کی جگہ لینے کے لئے دوسری آدمی بڑی تعداد میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ تکلیف اٹھانے کے لئے اس مستعدی کی وجہ سے تحریک کی اخلاقی طاقت نے ترقی کی۔ جب ہزاروں آدمی خوشی سے جیل جاتے ہوں۔ اور لاکھوں روپیہ دیتے ہوں۔ اور لاکھوں حکم ماننے کو تیار رہوں۔ تو تحریک کی کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اس نظارے کو دیکھ کر مجھے انگلینڈ کی سفرجسٹ (حقوق طلب عورتوں کی تحریک) تحریک

یاد آ گئی۔ اگرچہ اُس مجاہدے میں عدم تشدد سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ لیکن اُن کے مزاج کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ فرق صرف یہی تھا۔ کہ ہندوستانی تحریک میں ذرا سے تشدد سے بھی پرہیز کیا جاتا تھا۔ ایک ہنستی قوم نے قدرتی طور پر اس طریقے کو اختیار کیا۔ اُس نے تکلیف کو دعوت دی۔ اور اُس کو برداشت کیا۔ عورتیں اس اصول پر خوب عمل کر سکتی ہیں جو صدیوں سے پردے میں رہتی تھیں۔ اُنہوں نے حُب الوطنی کی آواز پر لبیک کہا۔ اور باہر نکل آئیں۔ اس حیرت انگیز تحریک میں اس سے زیادہ کوئی عجب بات نہیں۔ کہ عورتوں نے اُس میں خوشی خوشی جوشِ عقیدت کیساتھ حصہ لیا۔ اگر اُنہوں نے ابھی تک ہندوستان کے لئے سوراج حاصل نہیں کیا۔ لیکن اپنے جنس کے لئے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ سفر جبسٹ عورتوں کی طرح کانگرس نے خوشنمائی اور نفاست کا مظاہرہ کیا۔ یہ کشمکش محض تکلیف اُٹھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا ایک پہلا فرحت بخش بھی ہے۔ اُس کے والنٹیر جلوسوں میں فوجی ترتیب کیساتھ چلتے ہیں۔ سہ رنگی جھنڈے کیساتھ کیسری ساڑھیاں پہنے ہوئے عورتیں اور ہاتھ کاتے اور بنے ہوئے سفید لباس میں مرد بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ جلوس کے بعد عظیم الشان مظاہرہ ہوتا ہے۔ بمبئی میں یہ جلسے عموماً ساحلِ بحر کے پارک میں ہوتے ہیں۔ جن میں بیس بیس ہزار آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ باقرینے اور متانت جلسے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ مغرب میں کوئی مجمع ایسا خاموش اور متانت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ یہ ہندوستانی ہجوم ہوتا ہے چند آدمی کھڑے رہتے ہیں۔ اور اکثر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک طرف عورتیں دوسری طرف مرد۔ اور نہایت بے حس و حرکت اور خاموش۔ اور بڑی توجہ سے وہ رابندرناتھ ٹیگور کا قومی گیت یا پرانا بندے ماترم گیت سنتے ہیں۔ تقریریں اِس

قسم کی ضرور ہوتی ہیں۔ جنہیں قانون دان لوگ معنویانہ قرار دیں لیکن اُن میں بدامنی
کے لئے کبھی اشتعال نہیں دلایا جاتا۔ عموماً عدم تشدد کا وعظ کیا جاتا ہے۔ جب
دس کروڑ آدمی مقرر کر کے ہر ایک لفظ سے اتفاق کریں۔ تو اس قسم کی بغاوت
کو راسخ الاعتقادی کے قریب قریب سمجھنا چاہیئے۔ جس وقت مقرر تقریریں کر
رہے ہوتے ہیں۔ تو حاضرین میں سے وہ مرد اور عورتیں جو کانگرس کے زیادہ
عقیدت مند ہیں۔ تکلی پر سوت کاتتے جاتے ہیں۔ اس قسم کے جلسوں کو لاٹھیوں
کے حملوں سے منتشر کرنے کو سرکاری حلقوں میں امن قائم رکھنے سے منسوب
کیا جاتا ہے۔

میں نے بچشم خود لاٹھیوں کا کوئی حملہ نہیں دیکھا۔ اس کارروائی پر مختلف اوقات
میں مختلف قسم کا عمل ہوتا رہا ہے۔ میں جس زمانے میں بمبئی میں تھا۔ کانگرسی مظاہرہ سے
چشم پوشی کی جاتی تھی۔ میں نے بہت سے یورپینوں سے سوالات کئے۔ جو
ان حملوں کے شاہد عینی تھے۔ ان یورپینوں میں پولیس انسپکٹر بھی شامل تھے اور
ان حملوں کے میں نے بہت سے فوٹو بھی دیکھے ہیں۔ میرا یقین ہے۔ کہ اگر ایسے جلسوں
کے سوا ان کانگرسی جلسوں کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ تو کچھ ہرج نہ ہوتا۔ دراصل غلطی
اعلیٰ حکام کی ہے۔ جنہوں نے ان جلسوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ آخر میں کانگرس
کے ہر ایک جلسے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور باضابطہ طور پر انہیں منتشر کیا جانے لگا
اگر ان سے چشم پوشی کی جاتی۔ تو ہرگز کسی قسم کی بدامنی پیدا نہ ہوتی۔ اور لوگ
خود ہی ان سے اکتا جاتے۔ خاصکر بمبئی میں سختی کے ساتھ جلسوں کو منتشر
کرنے کی پالیسی سے تمام شہر غیظ آلود ہو گیا۔ پولیس کی لاٹھیاں کھانا فخر خیال
کیا جانے لگا۔ والنٹیر سینکڑوں کی تعداد میں جذبۂ شہادت سے مخمور مار
کھانے کے لئے بڑے شوق سے جاتے تھے۔ انہوں نے ضبط و انضباط

کا دلیرانہ مظاہرہ کیا۔ ہم نے اور تمام ہندوستان نے اس رفاقی پر بہار افسوس کیا۔ میں نے یونیوں کی زبانی سُنا۔ کہ دُبلے پتلے عدم تشدد کے پابند نوجوانوں کو بیٹے کٹے پولیسمینوں نے کس کس طرح سے مارا۔ ان لوگوں نے کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ میرے پاس ایک فوٹو ہے۔ جس میں والنٹیرز بن پٹیں و حرکت ایک صف میں بیٹھے ہیں۔ جبکہ پیچھے سے پولیس ان کے سروں پر لاٹھیوں کا مینہ برسا رہی ہے۔ اس موقعہ پر حملہ کرنے والے انگریز پولیس افسر تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بھاری بھاری لاٹھیاں تھیں۔ جن سے لوگ ناکارہ اور زخمی ہو سکتے تھے۔

مجھے اس میں ذرا شک نہیں۔ کہ پولیس انگریز افسروں کی ماتحتی میں بھی گورنمنٹ کے خلاف اظہار ناراضگی کی سزا جسمانی طور پر دیتی ہے۔ کلکتے میں کچھ طلبا یونیورسٹی کے ایک برآمدے سے پُرامن کانگرسی جلوس پر پولیس کے وحشیانہ حملے کو دیکھ کر پولیس کے برخلاف بُزدل بُزدل کے نعرے لگانے لگے۔ دو گھنٹے کے بعد پولیس والے ایک انگریز افسر کی ماتحتی میں واپس آ گئے۔ اور یونیورسٹی کی عمارت میں داخل ہو کر طلبا کی تمام جماعتوں پر دیوانہ وار حملہ آور ہوئے جبکہ طلبا اپنے ڈیسکوں پر بیٹھے ہوئے تھے لڑکوں کے خون کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر دیواروں تک پہنچے۔ یونیورسٹی کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کی گئی گورنمنٹ کی طرف سے برائے نام اظہار افسوس کیا گیا۔ لیکن کسی پولیس والے کو سزا نہیں دی گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل میں نے اُن پروفیسر کی زبانی سُنی۔ جو یورپ کی سائنٹفک دُنیا میں اعلیٰ شہرت رکھتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے ایک ہندوستانی جج کا لڑکا بھی ان طلبا میں شامل تھا۔ جن پر یونیورسٹی کے اندر حملہ کیا گیا۔ اُس نے بہت کچھ غصہ کا اظہار کیا۔ کاش! اُس کے خیالات سرکاری

افسروں نے قتل نہیں ہوتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ لاہور میں گذرا۔ جہاں پولیس نے ایک انگریز افسر کی ماتحتی میں ایک کالج پر حملہ کیا۔ اور نہ صرف طلباء کو بلکہ پروفیسر کو بھی زدوکوب کیا۔ اِن حملوں سے کوئی موت واقع نہیں ہوئی۔ جن پر حملے کئے گئے۔ وہ زندہ بچ رہے۔ لیکن حکومت کے خلاف اُن کے دِلوں میں نفرت بیٹھ گئی۔ بہت سے انارکسٹ اِسی قسم کی مار پیٹ سے بنائے گئے ہیں۔

ہندوستانی عدم تشدّد پر کیوں عامل ہیں؟

یہ بات سمجھنے کے لئے کہ یہ قوم جو قریب قریب اِس قدر متحد ہے عدم تشدّد پر کس وجہ سے عامل ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ فلسفہ مغرب سے انہیں ورثہ میں نہیں ملا۔ عدم تشدد ہندوستان میں ایک مذہبی عقیدے سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی نسلی خصلت ہے۔ جو مغربی تعلیم اور طرزِ عمل کے خلاف ہے۔ گاندھی جی نے صرف یہ کام کیا ہے کہ اِس عقیدت کو پختہ کر دیا ہے۔ جس زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد بالکل وحشی تھے۔ اُس وقت بھی ہندوستان اِس اصول پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اِسی نے ہندوستان کے چلن کو بنایا ہے۔ اِسی کی وجہ سے ہندوستانیوں نے اپنی غذا میں صلاح کی۔ کیونکہ وہ کسی کو جان لینا گوارا نہیں کر سکتے۔ زمانہ حال کی تاریخ میں ہندوستان نے پہلی دفعہ گاندھی جی کی ذات میں ایک ایسا لیڈر پایا ہے۔ جو اُس سے اندرونی احساسات کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی اُن عقائد کی جنوں نے ہندوستان کو بنایا۔ اب سے پہلے ہندوستان میں بڑے بڑے پولٹیکل لیڈر گزرے ہیں۔ لیکن اُن کے دماغوں کو مغربی خیالات نے ڈھالا تھا۔ یہ ٹھیک

ہے۔ کہ گاندھی جی نے لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن ہماری زبان پرحاوی ہونے کے علاوہ مغربی تعلیم کی اور کوئی شئے اُن کے پاس باقی نہیں رہی۔ جب ہندوستان نے مہاتما کی باتوں کو سُنا۔ تو اُس نے بڑے زور سے اُن پر دچار کرنا شروع کر دیا۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ مہاتما جی نے قوم پرستی کا خیال مغرب سے لیا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں۔ کہ قدیم ہندو اصُولوں پر عمل کرنے سے کامیابی حاصل ہوگی۔

اگرچہ اِس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ کئی کروڑ ہندوستانی ایسے ہیں جن کے نزدیک عدم تشدد مصلحت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اُن کے خیال میں اِس اصُول پر اِس لئے عمل کرنا ضروری ہے۔ کہ ہندوستانی نہتے ہیں اور فوجی روایات سے بے بہرہ ہیں۔ اور اُن کا مُقابلہ ایسے دُشمن سے ہے۔ جسے یہ دونوں چیزیں حاصل ہیں۔ عدم تشدد بلاشبہ ایک ایسی چال ہے۔ جس کے متضاد نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ دشمن کو پریشان بھی کر سکتا ہے۔ جو عام ہڑتال کے ذریعے ممکن ہے۔ جس سے مُلکی انتظام اور تجارت کا کام چلانا ناممکن ہو سکتا ہے۔ یہ اُس کا ایسا پہلو ہے۔ جیسے ہم مغرب کے لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہم حکم دیں۔ اور کوئی اِس کی تعمیل نہ کرے۔ جب کوئی شخص ٹیکس ادا نہ کرے۔ اور جو چیزیں ہم ہندوستان میں درآمد کریں۔ انہیں کوئی نہ خریدے۔ تو بس پھر سلطنت کا خاتمہ ہے۔ لیکن اہنسا کے ایک فلسفیانہ معنی بھی ہیں۔ ایک شخص اپنے دشمن پر محبت کے ذریعے غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اُس کی تجارت کا بائیکاٹ کرنے کا یہ نتیجہ مشکل نکل سکتا ہے علاوہ ازیں اپنے آپ کو ضبط میں رکھ کر کوئی شخص اپنے دشمن کو اُس کے تشدد پر نادم کر سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور اُن کے بڑے بڑے چیلوں کے خیال

میں اہنسا خلاقی انضباط کا ایک جزو ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہونا چاہتا ہے۔ تو اس کے لئے اس مرحلہ سے گزرنا ضروری ہے۔ قدیم روایات چلی آتی ہیں۔ جن پر ہندوستانی گہرا یقین رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ جو سادھو اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ وہ تمام کائنات پر حکم چلا سکتا ہے۔ لہذا شاستروں میں ایسے جوگیوں کا بہت ذکر ہے۔ جنہوں نے یوگ کے ذریعے بہت کچھ طاقتیں حاصل کیں۔ یعنی ستاروں کی رفتار کو بدل دیا۔ اور شہنشاہوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلایا۔

مہاتما جی جب لنگوٹی باندھے ہوئے زمین پر آسن جما کر دھیان میں بیٹھتے ہیں۔ تو ہندوستانیوں کو یوگیوں کی عظمت کی کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ اگرچہ مہاتما جی کے خیال میں لنگوٹی کا مطلب کچھ اور ہے۔ ان کے ملک میں جہاں ایک طرف بڑے بڑے دولتمند ہیں۔ وہاں برہنہ تن مفلس بیشمار ہیں۔ انہوں نے غریبوں میں شامل ہونا پسند کیا۔ وہ کوئی لباس نہیں پہنتے۔ اور ایسی کوئی خوراک نہیں کھاتے۔ جو انہیں دیہات کے اچھوتوں سے تمیز کر سکے۔ مذہب کے اس مغز میں اس لاثانی تحریک کی اصلیت مخفی ہے۔ اور یہ انکی طاقت کا راز ہے

آجکل کے ہندوستان میں بھی لوگ ہمارے ہوائی جہازوں کی گونج اور ہماری مسلح کاروں کی گڑگڑاہٹ سے مرعوب نہ ہو کر مذہبی اذان کو توجہ سے سنتے ہیں۔ ایک فرزانہ سائینس دان نے اپنا تجربہ مجھ سے بیان کیا۔ وہ شمال قبیلے کے درمیان رہتا تھا۔ جو ایک نیم وحشی پہاڑی قبیلہ ہے۔ وہ روز ازل سے شکار پر بسر اوقات کرتے تھے۔ انہیں خبر ملی۔ کہ نیچے میدانوں میں ایک سنت کا ظہور ہوا ہے۔ اس نے ایک پیغام بھیجا انہوں نے بڑی سنجیدگی سے غور کیا۔ اور اس کے حکم کی بسر و چشم تعمیل کی۔ مہاتما نے ان سے کہا تھا۔

کہ جنگل کے جانوروں کو امن میں رہنے دو۔ انہوں نے اپنے تیر کمان جلا دیئے۔ اور برچھیاں توڑ ڈالیں۔ اور بے شمار صدیوں کے بعد پہلی دفعہ انہوں نے زمین پر ہل چلانا شروع کیا۔

اِس بے نظیر لیڈر کے لئے سیاسیات اُس کی اخلاقی تعلیم کا محض ایک نتیجہ ہے۔ جس وقت تحریک نہایت زور شور پر تھی۔ تو جیل خانے کی کوٹھڑی سے ہر ہفتے وہ ایک مضمون لکھ کر بھیجتا تھا۔ کبھی سچائی کی اہمیت پر اور کبھی برہمچریہ کی تعریف میں۔ اُس کے چیلے اُس کی مشکل تعلیم پر عمل کرنے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ میں نے ریاست بڑودہ میں دیکھا۔ کہ کانگرس والوں نے درزشوں کا ایک جلسہ کیا تھا۔ وہاں پیرل پار کے ساتھ نوجوانوں نے تازہ پھولوں کی ایک ویدی برہمچریہ کے دیوتا کے لئے بنائی تھی۔

ہندوستانی لوگ مہاتما کے اقوال کو بڑے تقدس کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اِس طور پر جس طرح کہ راسخ الاعتقاد عیسائی خداوند یسوع مسیح کے اقوال کو تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بمبئی کے ہندو بازاروں میں کوئی دکان نہ ہوگی۔ جہاں مہاتما کی تصویر آویزاں نہ ہو۔ میں نے ایک خانہ بدوش قبیلے کے ایک آدمی کی جھونپڑی میں بھی یہ تصویر دیکھی۔ جس کے پاس اپنے اوزاروں اور مٹی کے برتنوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ تصویریں پھیری والے بساطی بیچتے ہیں۔ جو کرشن مہاراج کی تصویریں فروخت کرتے ہیں۔ اور ہر شخص انہیں خرید سکتا ہے۔ اگرچہ شرع اسلام میں تصویروں کا رکھنا ممنوع ہے۔ چنانچہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مسلمان تصویریں نہیں بیچنے دیتے۔ مہاتما کو جیل میں ڈال کر ہم نے اُسے سردیا پاک بنا دیا ہے۔ یہ برہنہ تن سنت خود ضبطی کا اوتار ہے۔ اُس کے اصول کی پیروی کر کے ساتھ ہزار

کانگرسیوں نے جیل کی مصیبتیں برداشت کرنے کی طاقت حاصل کی۔ ان میں سے ایک شخص کا بشرہ میری یاد سے محو نہیں ہوتا۔ وہ ایک وکیل ہے۔ وہ گاندھی کی تحریک میں شامل تھا۔ میرٹھ کے قریب ایک مقام پر کسی جلسے میں اس نے تقریر کی۔ یہ جلسہ بندوقوں کی گولیوں سے منتشر کر دیا گیا۔ اس نے غضبناک ہجوم کو شانت کرنے کی کوشش کی۔ اور رضاکاروں نے کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں طرف والنٹیر کھڑے کر دیئے۔ تاہم وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور پولیس نے اسے پیٹا۔ بلکہ ایک پولیسمین نے جبکہ وہ گرفتار ہو چکا تھا۔ قریب سے اس پر فائر بھی کیا۔ جب وہ زمین پر بیہوش پڑا ہوا تھا۔ تو پولیس والوں نے اس کے ٹھوکریں لگائیں۔ اور پانچ گھنٹے کے بعد اس کی مرہم پٹی کی نوبت آئی۔ اس کا دایاں بازو کاٹا گیا۔ اور اپریشن کے دوسرے روز اسے ہسپتال سے جیل میں لے گئے۔ اس نے یہ ساری کہانی سنائی۔ جبکہ اس کے الفاظ میں تلخی کا کہیں نام نہ تھا۔ فتحمندانہ شانتی کا نور اس کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ اس نے بیان کیا۔ کہ میں اور میرے دوست جیلخانے میں بڑے خوش و خرم تھے۔ اور ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ کہ اب ہمیں یقین آیا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ہم نے مہاتماجی کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا ہم نے گولیاں تک کھائیں۔ لیکن غصے سے باز رہے۔ اس شخص کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر جو اپنی شرافت پر نازاں تھا۔ افسوس نہیں ہوتا تھا۔

جب کوئی شخص اس تحریک کے فلسفہ نفسیات کو جیسا کہ وہ مہاتماجی کے خیال میں ہے۔ سمجھ لیتا ہے۔ تو اس کے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کے موسم گرما میں جب مہاتماجی وائسرائے سے بات چیت کر رہے تھے۔ تو ان کا رویہ اس قدر سخت کیوں تھا۔ انہیں فوری طور پر کوئی

سیاسی مقصد حاصل کرنے کی تیاری نہ تھی۔ اِس تحریک سے جو۔ بے انتہا مصائب، تشویش، اور مادی نقصانات پہنچے۔ مہاتماجی کے خیال میں ان کا اُن ذہنی فوائد کے مقابلے میں جو حاصل ہوئے۔ کوئی ہستی نہ تھی۔ اُن کے نزدیک یہ آزادی کے لئے محض ایک تیاری تھی۔ جو قوم محکومی کی مزاحمت کرتی ہے خواہ وہ عدم تشدد کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ اِس کی آتما آزاد ہو جاتی ہے۔ غیر حکومت کی محکومی کی ذلت کے خلاف اُنھوں نے بغاوت کی تھی۔ اور جو طریقے اختیار کئے گئے۔ اُن کی غرض و غایت یہ تھی۔ کہ برطانوی حکومت کے جاری رہنے کو ناممکن بنا دیا جائے۔ اور اُس سے بڑھ کر یہ ہندوستانیوں کو خوداری کی تربیت دی جائے۔ ان طریقوں کے کئی مرحلے تھے۔ ایک دُوسرے سے دُشوار تر۔ لیکن ایک سے ایک بڑھ کر کارگر۔

چند سال ہوئے۔ چرخے کو زندہ کرنے کیساتھ اِس کٹھن منزل میں قدم رکھا گیا۔ ہمارے مغربی نقطہ خیال سے اِس سے بڑھ کر کوئی خبط نہیں ہو سکتا۔ لیکن مہاتما گاندھی کے چیلوں کے لئے چرخہ کاتنا ایک مذہبی فرض بن گیا ہے۔ ایک روز میں اپنے میزبان کے گھر تیسری ایک ناسٹ کے لئے بالاخانے سے اُترا۔ یہ ایک ڈاکٹر تھا جس نے سکاٹ لینڈ میں تعلیم پائی تھی کیا دیکھتا ہوں۔ کہ آپ زمین پر بیٹھے ہوئے چرخہ کات رہے ہیں۔ وہ روزانہ ایک گھنٹہ کاتنے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ بعض دفعہ دیکھا گیا۔ کہ ریل گاڑی میں ایک لیڈر سوار ہے۔ اُس نے تہ ہونے والا چرخہ نکالا۔ اور اُس کے پرزے درست کر کے خاموشی سے کاتنا شروع کر دیا۔ چرخہ اِس تحریک کی جان ہے۔ اکثر دیہات میں کاشتکاروں کو جبکہ کھیتی باڑی کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ چرخہ چلاتے دیکھا گیا ہے۔ ایک غیر اقتصادی بے سود صنعت کو

زندہ کرنے سے چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ہماری مشینی تہذیب سے مہاتما کو نفرت ہے۔ کیونکہ وہ اسکن کے پیرو نہیں۔ بلکہ اس بغاوت میں ٹالسٹائی کے پیرو ہیں۔ وہ جس قدر برطانوی جھنڈے کے مخالف ہیں۔ اسی قدر مغربی مشینوں کے۔ دوسرے یہ ایک طریقہ ہے۔ جس سے ہندوستان لنکاشائر کو خراج دینے سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن یہ زیادہ تر دیہاتیوں کو اُن کی بہروں از قیاس مفلسی میں تھوڑی سی مالی مدد دینے کا سیدھا طریقہ ہے۔ جہاں کہیں نہری آبپاشی نہیں ہے ہندوستان کی آب و ہوا اور زراعت کے قدیم طریقوں کی وجہ سے کاشتکاروں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ سال میں سات آٹھ مہینے سے زیادہ کھیتی کا کام کر سکیں۔ اگر کسی کے پاس مضبوط بیل ہیں۔ تو وہ چھکڑے چلا سکتا ہے۔ اور اگر کوئی پارچہ بافی کا کارخانہ قریب ہے۔ تو کوئی کاشتکار اس میں کام کر سکتا ہے لیکن کاشتکاروں کی بڑی تعداد سال کے ایک تہائی حصے میں بیکار رہنے پر مجبور ہے۔ اگر سرمایہ ہو۔ تو دیہاتی صنعتیں قایم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سرمایہ کمیاب ہے۔ چرخہ ہر جگہ بن سکتا ہے۔ اور دو چار روپے میں خرید جا سکتا ہے اور سوت بیچنے کے لئے کسی منڈی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف جلاہوں کے پاس لیجانا کافی ہے۔ جو اکثر دیہات میں ابھی تک باقی ہیں۔ جو قرض کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے اور نیم فاقہ مست ہیں۔ اور تھوڑی سی مزدوری پر مشینوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ یہ درست ہے۔ کہ دن بھر سوت کات کر ایک آدمی ایک یا دو آنے سے زیادہ نہیں کما سکتا۔ لیکن جس حال میں کھیتوں میں کام کرنے والوں کو طلوع آفتاب سے دن چھپنے تک مشقت کرنے کے عوض پانچ سے لیکر ڈھائی آنے یومیہ سے زیادہ نہ ملتے ہوں۔ اور جب کھیتوں

میں کوئی کام نہ ملے۔ تو کیا ایک آنہ غنیمت نہیں ہے۔ ہاتھ سے بُنے، بُنے ہوئے
کپڑے کی آج کل بہت مانگ ہے۔ کیونکہ حُب الوطنی اُس کی حامی ہے۔
ہندوستانی افسر تک جو دفتروں میں بدیشی کپڑے پہن کر جاتے ہیں
شام کے وقت اپنے گھروں میں ہاتھ کے بُنے ہوئے کھدر کا لباس تبدیل
کر لیتے ہیں۔ پس ایک طرف ہندوستانی کھدر کی تحریک سے
ایک طرح ہندوستانی دیہاتوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اور
دوسری طرف لنکا شائر کو ضرب لگا سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ ایسا ہے۔ کہ اُس پر عمل کرنا بغاوت کی حدود میں قدم رکھنا
ہے۔ اور وہ نمک سازی کے متعلق گورنمنٹ کی اجارہ داری کو چکنا چور کرنا ہے۔ یہ انقلاب
کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اِس خیال پر ہنسی آتی ہے۔ کہ سمندر کا پانی ایک کیتلی میں
گرم کرنے سے شہنشاہ معظم کو حکومت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ
معمولی سرگرمی بھی سرکاری محاصل پر ایک حملہ ہے۔ اور اُس کی وجہ سے ہزاروں
ہندوستانی جیلوں میں چلے گئے۔ خود مہاتما گاندھی بھی اِسی زمرے میں گئے
تھے۔ وہ ہندوستانی پبلک کے مزاج شناس ہیں۔ انہوں نے نمک سازی کو
ایک نیم مذہبی یاترا کی صورت دی۔ اِس کارروائی کی معصومیت نے مطیعِ قانون
ہندوستانیوں کو سول نافرمانی کے پانی میں پہلا غوطہ دیا۔ یہاں بھی یہی دلیل
پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ یہ مفلس کاشتکاروں کو ایک قسم کی مدد دیتا تھا۔ اور
ہندوستانی صنعت کے تحفظ کا سوال خود بخود سامنے آ گیا۔ لوگ کہتے ہیں
کہ جب بمبئی اور بنگال کے ساحلوں پر سمندر کا پانی آفتاب کی حرارت سے
خشک ہو سکتا ہے۔ تو پھر یورپ سے ہندوستان میں نمک منگانے کی کیا ضرورت
ہے۔ میرے خیال میں اِس تحریک کا قدیم روایات سے بھی کچھ تعلق ہے

زمانہ قدیم میں جب کوئی شخص کسی کا نمک کھا لیتا تھا۔ تو پھر اس کو دغا دینے
کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ جو کوئی کسی بڑے آدمی کا نمک خوار ہوتا۔ تو وہ ہمیشہ
اس کا وفادار رہتا تھا۔ نمک کا ٹیکس ان ٹیکسوں میں سے ہے۔ جو اچھے نہیں
سمجھے جاتے۔ براہ راست ٹیکسوں سے پبلک ہمیشہ متنفر رہتی ہے۔ اور
مزدوروں کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس ٹیکس کی وجہ
سے ہندوستان میں فی کس ساڑھے تین آنے سالانہ بیٹھتے ہیں۔ لیکن ایک
مزدور خاندان کے مالک کے لئے یہ بھی سال بھر میں چار دن کی اجرت ہے۔
شراب کے ٹھیکوں کے متعلق جو حملہ کیا گیا۔ وہ زیادہ زبردست تھا۔
محاصل شراب سے بعض صوبوں کی گورنمنٹیں اپنی مجموعی آمدنی کا ایک چوتھائی
حصہ حاصل کرتی ہیں۔ ہندوستان میں شراب خواری عام نہیں ہے محض نیچ
ذاتوں میں اس کا رواج ہے۔ ملک کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی رو سے
اُسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کانگرس نے جب پُرامن پکٹنگ کے ذریعہ سرکاری
شراب کی دکانوں کا بائیکاٹ کیا۔ تو ہندوستان کی اخلاقی حالت اس کے پس
پشت تھی۔ اور بڑی حد تک انہیں اُسے کامیابی ہوئی۔ بمبئی میں شراب کے ٹھیکوں
کی سالانہ نیلامی بند ہو گئی۔ اور یہ ٹھیکے پرائیویٹ معاہدوں پر نصف رقموں پر کئے
گئے۔ اکثر مقامات میں شراب کی دکانیں بند ہو گئیں۔ کسی ہندوستانی میں یہ
جرأت نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی لعنت ملامت کی پرواہ نہ کر کے کسی
شراب خانے میں داخل ہو جائے۔

بعض مقامات پر برادری کی پنچایتوں نے ترک شراب خواری کی ٹوٹ کر
کی حمایت کی۔ آخر کار گورنمنٹ کو یہ کرنا پڑا۔ کہ اس نے جس طرح بھی ہو شراب
کی فروخت کی اجازت دیدی۔ اور معمولی پابندیاں اٹھا دی گئیں۔ بجز جمعہ بار

دینے کی صاف علامت تھی۔ اِس ایجی ٹیشن کا نہایت دلچسپ پہلو یہ تھا کہ عورتوں نے اس میں کافی حصہ لیا۔ میں نے دیکھا ہے۔ کہ دُبلی پتلی عورتیں، جو کہ سُست و آرام کی زندگی کی عادی تھیں۔ شراب کی دوکانوں کے عقبی دروازوں پر آٹھ آٹھ گھنٹے نالیوں کے پاس کھڑے رہ کر پکٹنگ کرتی تھیں۔

مہاتما گاندھی نے بادلِ ناخواستہ تمام بدیشی مال اور خاصکر انگریزی کپڑے کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی۔ بادلِ ناخواستہ اس وجہ سے کہ یہ اَمر اُن کے عالمگیر پریم و محبت کے عقیدے کے خلاف تھا۔

یہ بائیکاٹ تمام ہندوستان میں بڑی سرگرمی کے ساتھ کیا گیا۔ اگر مہاتما جی کے ملنے والوں پر یقین کیا جائے۔ تو اس تحریک کا مقصد اس قدر انگلینڈ کی تجارت کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ جس قدر دیسی صنعت کو ترقی دینا تھا لیکن عام لوگوں کے مزاج کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب لوگ موٹر بسوں میں سوار بازاروں سے گذرتے تھے۔ تو ہر ایک یورپین کو دیکھ کر بائیکاٹ کے نعرے لگاتے تھے کانگرس نے تھوک فروش اور خوردہ فروش تاجروں سے اقرارنامے لکھوا لینے شروع کئے۔ کہ وہ تو کوئی مال باہر سے نہ منگوائیں گے۔ اور جو بدیشی مال اُن کے پاس ہے۔ نہ اُسے فروخت کرینگے۔

اس قسم کا حکم دے کر عام کامیابی حاصل کرنا۔ کانگرس کی طاقت کا بہترین ثبوت ہے۔ میں جس زمانے میں بمبئی میں تھا۔ تو کانگرس کی طاقت کی آزمائش ہوتی۔ جو سوداگر سوتی کپڑا ولائیت سے منگاتے تھے۔ انہوں نے عہد کیا۔ کہ چھ مہینے تک وہ کوئی آرڈر نہیں دینگے۔ لیکن اُن کے گوداموں میں سینتیس لاکھ پونڈ کا مال موجود تھا۔ جو صرف ہندوستانی منڈیوں میں ہی فروخت ہو سکتا تھا۔ یہ مال واپس نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ اور گوداموں میں

پڑا پڑا خراب ہو رہا تھا۔ اِن تاجروں نے ایک جلسہ کیا۔ اور بڑی لجاجت کے لہجہ میں ایک رزولیوشن پاس کیا۔ کہ وہ اِس مال کو فروخت کرینگے۔ اور اِس کے بعد کوئی مال ولائیت سے نہیں منگائینگے۔ مگر کانگرس نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ اور جیسا کے بعد سے واقعات سے ثابت ہُؤا۔ اُس نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ نہیں کیا تھا۔ صدہا و الفیر عورتیں سٹوک فروش تاجروں کے بازار میں گئیں۔ اور اُنہوں نے ہر ایک دوکان اور دفتر پر پکٹ لگا دئے۔ اُن میں سے بعض نے یہ اعلان کیا۔ کہ اگر سوداگروں نے اپنا ریزولیوشن واپس نہ لیا۔ تو ہم بھوک ہڑتال کر دینگی۔ آخر ایک جلسہ ہُؤا۔ جس میں بڑے بڑے قوم پرستوں نے زبردست تقریریں کیں۔ اور اُس روز پکٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی فیصلہ ہو گیا۔ کلرکوں اور قلیوں نے۔ گوداموں کے کھولنے اور کپڑے کی گانٹھیں نکالنے سے انکار کر دیا۔ اور کانگرس کو فتح حاصل ہُوئی۔

برٹش بورڈ آف ٹریڈ کی کسٹم رپورٹ سے ظاہر ہُؤا۔ کہ اِس بائیکاٹ کا کیا نتیجہ نکلا۔ سن ۱۹۳۰ء کے موسمِ خزاں میں سُوتی کپڑے کی درآمد کی مقدار اُس سے ایک تہائی یا ایک چوتھائی رہ گئی۔ جس قدر کہ سالِ ماسبق کے اِس مہینے میں ہُوئی تھی۔ اور جس قدر ولایتی سگریٹ سالِ گذشتہ کے اِس مہینہ میں آتے تھے۔ اب کی دفعہ اُس سے ایک چھٹی قیمت کے لئے آتے۔ بمبئی میں پارچہ بافی کے سولہ کارخانے جن کے مالک انگریز تھے۔ بند ہو گئے۔ اور اِن کارخانوں کے بتیس ۳۲ ہزار مزدور بیکار ہو گئے۔ بخلاف اُس کے ہندوستانی کارخانے جنہوں نے کانگرس سے معاہدہ کر لیا تھا۔ دو چند کام کرنے لگے۔ اور اُنہوں نے باریک کپڑا بُننے کے لئے اپنی مشینوں کو دُرست کر لیا۔

ہندوستان کو سمجھنا اِس لئے مُشکل ہے۔ کہ اُس کے آدرش اُس کی

قدیم روایات سے وابستہ ہیں۔ اِس تحریک میں ہندوستانی اِس طرح اُلجھ گئے کہ اُن کا نکلنا مُشکل تھا۔ مُمکن ہے کہ مہاتما نے اِن طریقوں کو اِس خیال سے اختیار کیا ہو۔ کہ آزادی کے لیئے ہندوستانی کیریکٹر کو چمکایا جائے۔ لیکن فی الحقیقت شراب کے بائیکاٹ کے سوا اور تمام طریقے ایسے تھے۔ جن کی بُنیاد اقتصادی تھی۔ ہندوستان کو بیرُونی مال پر محصُول لگانے کی آزادی حاصل ہے۔ جس سے دیسی صنعتوں کو کسی قدر تحفظ ملتا ہے۔ چُنانچہ برٹش مال پر بھی محصُول لگا ہُوا ہے۔ لیکن ہر جگہ مزید تحفظ کا مُطالبہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ موجُودہ صنعتوں کو ترقی حاصل ہو۔ اور نئی صنعتوں کے لئے میدان نکلے۔ علاوہ اِس کے ہندوستانیوں کو خودداری کا بہت کچھ خیال ہے۔ لیکن اُن کی قوم پرستی کی تہ میں اقتصادی فوائد مضمر ہیں۔ خاصکر بمبئی والوں نے اِس تحریک کو اپنے حق میں مُفید سمجھا۔ جو دیشی مال کا بائیکاٹ کرتی تھی۔ یہ لوگ طبعًا خواہ قدامت پسند ہوں۔ لیکن اُنہوں نے کھُلے دِل سے مالی امداد دیکر بلکہ بعض دفعہ خطرے میں پڑھ کر بھی اُس ایجی ٹیشن کی مدد کی۔ جس کا انجام ممکن ہے۔ کہ یہ ہو۔ کہ انقلاب کی آگ بھڑک اُٹھے بمبئی کے کارخانوں کے بعض مالکوں کی عورتیں اور لڑکیاں جیل میں بھی گئیں۔

تحفظ کے اِس مُطالبے کو عوامُ النّاس کی تائید حاصل ہے۔ کیونکہ ہندوستان عرصہ دراز سے بیکاری کے ہاتھوں تنگ ہے۔ اور تعلیم یافتہ جماعت پر حد درجہ کا افلاس طاری ہے۔ ہزارہا نوجوان جب مدرسوں یا کالجوں سے نکلتے ہیں۔ تو انہیں روزگار کے لیئے تمام دروازے بند ملتے ہیں۔ انہیں آسانی سے یقین دلایا جاسکتا ہے۔ کہ جب ہندوستان کو اقتصادی آزادی حاصل ہو گی۔ تو اُن کے لیئے صنعتی کارخانوں میں اور بنکوں میں ریلوے اور سرکاری ملازموں میں جگہ نکلیگی۔ ممکن ہے۔ کہ یہ درست ہو۔ اگرچہ اُن میں سے بہت کم کو ایسی تربیت ملی ہے۔ جس سے وہ کوئی مُفید

کام کر سکیں۔

گورنمنٹ ہند کی کارروائی سے کہ اُس نے روپیہ کی قیمت سولہ پنس سے اٹھارہ پنس کر دی ہے۔ یہ اقتصادی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ کارروائی بالکل ایسی ہے۔ جیسی کہ مسٹر چرچل نے سٹرلنگ کے نرخ کے تبادلہ میں اضافہ کر دیا تھا۔ اِس سے قرضخواہوں اور مالکانِ جائیداد کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور تجارتِ درآمد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور تجارت برآمد کو نقصان۔ قصہ مختصر یہ کہ بہیئت مجموعی اِس سے انگلستان کو فائدہ اور ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ اِس کارروائی سے ہندوستان کو جو قرضہ انگلینڈ کو دینا ہے۔ اُس میں گیارہ فیصدی کا اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان کی اقتصادی شکایتوں کا شمار کرنا مشکل ہے۔ جن کی وجہ سے ہندوستانی سرمایہ دار اور تاجر تقریباً یک جہتی کے ساتھ کانگرس کے حامی بن گئے۔ اگرچہ اس ایجی ٹیشن سے تمام ساہوکارے اور تجارت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اُنہوں نے کانگرس کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ اُس وقت بھی جب کہ اُن کے کارخانے اور دوکانیں بند کر دی گئیں۔ اور اُن کے بدیشی مال کا ذخیرہ عملی طور پر منضبط کر لیا گیا۔ اُنہوں نے یہ سب کچھ اِس اُمید پر برداشت کیا کہ آج کے نقصان کی تلافی مستقبل کے فوائد سے ہو جائیگی۔

ایک طرف طلائی معیار قائم کر کے گورنمنٹ ہند نے ناواجب طور پر روپے کی قیمت بڑھا کر تجارت پیشہ لوگوں کو ناراض کیا۔ اور دوسری طرف اُس کی مالی پالیسی نے کاشتکاروں کو سخت ضرب لگائی۔ اُس نے چاندی کا روپیہ ڈھالنا بند کر دیا۔ اور جو چاندی ریزرو میں تھی۔ وہ فروخت کر دی۔ اور اِس طرح سے پانچسال کے عرصے میں چاندی کی قیمت گھٹتے گھٹتے نصف رہ گئی۔ اور اِس کی وجہ سے کاشتکاروں کی ساکھ بھی آدھی رہ گئی۔ ہندوستانی دیہات میں بنک

نہیں ہوتے۔ قصبات میں بہت تھوڑے بنک ہیں۔ یہ لوگ اپنی بچت کے روپیے کو جمع کرتے ہیں۔ اِس بچت سے اُن کی بیویاں زیور کی شکل میں اپنے جسم کو زینت دیتی ہے۔ یہ زیورات زیادہ تر چاندی کے ہوتے ہیں۔ اور اُن کی کفالت پر کاشتکار لوگ قرضہ لیتے ہیں۔ چاندی کی قیمت گھٹ جانے سے دیہاتیوں کی بچت کی قیمت نصف رہ گئی۔ اور قحط کے وقت گزارہ کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تمام دُنیا کا تجارتی مندہ اِس اقتصادی بے چینی تحریک کے پس پُشت تھا۔ زراعتی پیداوار کی قیمت تباہی بخش حد تک گر جانے سے جنوبی امریکہ میں انقلاب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن ہندوستان میں یہ ایک غضبناک طوفان کی طرح نمودار ہوئی۔ کاشتکاروں نے دیکھا۔ کہ ایک فصل سے دُوسری فصل میں ان کی پیداوار نصف یا ایک تہائی رہ گئی ہے۔ وادیٔ گنگا میں تین سال کے عرصے میں گیہوں کی قیمت سات روپے من سے چار روپے من اور پھر دو روپے من رہ گئی بنگال کے کاشتکاران جیوٹ کو بھی یہی حالت پیش آئی۔ دیہات تباہ ہوگئے۔ اِن کی بچت کے مال کی قیمت نصف رہ گئی۔ اُن کی پیداوار کی قیمت بھی آدھی رہ گئی لیکن اُن کے قرضے اور اُن کے ٹیکس اور مالیہ اور لگان جوں کے توں باقی رہے اگر وہ لگان ادا کریں۔ تو فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر ادا نہ کریں۔ تو باغی بننا پڑتا ہے وہ اِسی سوچ بچار میں تھے۔ کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کہ اِسی اثناء میں اُس شخص کی آواز سُنائی دی۔ جس کا وہ تقدس کرتے تھے۔ اور اُنہوں نے وہی سُنا۔ جس کی تمنا رکھتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے ٹیکس ادا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ایک طور پر اِس فرض کا ادا کرنا نہائت آسان تھا۔ کیونکہ دیہاتی مالیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ غرضیکہ نرخ تبادلہ کی پراسرار کارروائی اور پیداوار کی قیمتوں کے گر جانے سے یہ خاموش اور غیر ہمدرد دیہاتی سیاسیات میں کود پڑے۔ اور

اور کانگرس کے زبردست حامی بن گئے۔ اور شمالی ہند کے وسیع رقبے میں انہیں کش مکش کے لیئے تیار کر لیا گیا۔ یعنی آدائیگی ٹیکس سے انکار کرنے کے لیئے یہ عدم ادائیگی کی تحریک سارے ملک میں نہ تھی۔ کیونکہ دکن اور پنجاب میں اس کا ظہور نہیں دیکھا گیا۔ گجرات میں لگان اراضی ادا کرنے سے انکار کیا گیا۔ بہار اور بنگال کے بعض حصوں میں چوکیدارہ ٹیکس کی مزاحمت کی گئی۔ صوبجات متحدہ میں تحریک سے آخری دنوں میں کاشتکاروں نے لگان اور مالیہ دونوں ادا کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ جس وقت یہ کارروائی ہو رہی تھی۔ تو دیہات کے مکھیا اور پٹیلوں سے استعفٰے طلب کیئے گئے۔ بیشمار دیہات کے دیہاتی افسروں نے استعفٰے دیدیئے بعض اضلاع میں کاشتکاروں نے قانون جنگلات کی خلاف ورزی کی لیکن دیہات کی کشمکش مکمل تفصیل کی محتاج ہے۔ ہندوستان میں اس تحریک کے لئے زبردست جذبہ پیدا کرنے میں مہاتما گاندھی کی لاثانی شخصیت نے فیصلہ کن حصّہ ادا کیا۔ اُن کے بغیر یہ قابل دید اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے ملک کے جذبات کے روایتی سوتوں کو متحرک کیا۔ اُن سے پہلے کسی لیڈر نے آج تک ایسا نہ ہو سکا تھا۔ اُنہوں نے تحریک کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی پیمانے پر رکھی۔ اور لوگوں کے اُن عقیدے سے اپیل کی۔ جس کی بنیاد ہندوستانی نسل میں طبعاً ودیعت ہے۔ لیکن اقتصادی حالات اگر مدد نہ کرتے۔ تو یہ قومی تحریک اس قدر وُسعت اختیار نہ کرتی۔ دیہاتیوں میں یہ بیداری پیدا نہ ہوتی۔ اور نہ سرمایہ دار اُس کے حامی ہوتے دکانداروں سے ہڑتال کرا لینا آسان ہے۔ کیونکہ دُوسرے دنوں میں بھی اُن کے مال کی فروخت بہت کم ہوتی تھی۔ بدیشی مال خریدنے سے باز رہنا بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ لوگوں کے پاس اُس کے خریدنے کے لیئے پیسہ ہی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکار کا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے میں حُب الوطنی

اور اُن کی خالی جیبیں باہم متفق تھیں۔ اور نوجوانوں کی بیکاری کی وجہ سے تحریک کے لئے والنٹیر آسانی سے ملجاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اِس غرض سے نہیں کہی جاتیں۔ کہ سحریک کی یا اُن کے لیڈر کی حقارت کی جائے۔ اور نہ اُس کی صدق دِلی میں کچھ کلام ہے۔ ان کے بیان کرنے کا مُدعا صرف یہ ہے۔ کہ تاریخ کے بنانے میں اقتصادی اسباب کہاں تک اپنا کرشمہ دکھایا کرتے ہیں۔

میکسمن کمیٹی کی رپورٹ نے اِس کے متعلق چند دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ اگرچہ اُس میں خصُوصیّت کے ساتھ ہندوستان کا ذکر نہیں۔ لکھا ہے کہ تاریخ کے مُطالعہ سے اِس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ تمام مجلسی مُشکلات کا اصلی راز قیمتوں کی سطح کے بدلنے اور اُس کی وجہ سے قرضخواہوں اور مقروضوں کی حالت میں تبدیلی واقع ہونے اور مزدوروں اور کسانوں اور ٹیکس وصُول کرنے والوں کی حالتوں کے تبدّل میں مُضمر ہے۔

دُوسرے مُلکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں چیزوں کی تھوک قیمتیں نہایت تیزی کیساتھ گری ہیں۔ پہلے سال میں یعنی ستمبر ۱۹۳۰ء تک چیزوں کی تھوک قیمتیں ہندوستان میں ۲۰ فیصدی کم ہوئیں۔ جب کہ امریکہ میں ۱۳ فیصدی اور برطانیہ میں ۱۵ فیصدی کمی واقع ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۱ء تک کلکتے میں دو سال کے اندر ۳۰ فیصدی نرخ گر گئے۔ لیکن بنگال کے دیہات میں جہاں چاول اور پٹ سن سب سے بڑی پیداوار ہیں یہ قیمتیں نصف رہ گئیں سونے کی قیمت دفعتہً بڑھ جانے اور زراعتی پیداوار کی قیمتیں اس قدر گھٹ جانے سے ایک مقروض مُلک اور باہر کی دُنیا کے تعلقات میں بڑا بھاری خلل پڑا۔ دو سال کے اندر برطانیہ کا قرضہ ہندوستان پر ایک تہائی کے قریب بڑھ گیا۔ اور امپیریل قرضخواہ کے خراج میں اِسی تناسب سے بغیر

کسی مزید خدمت کے اضافہ ہو گیا۔ روپے کی قیمت عمداً بڑھا دینے سے اس خراج میں اسی فی صدی کا اضافہ ہؤا ہے۔ چیزوں کی قیمتیں گھٹ جانے سے انگلینڈ میں بھی کچھ کم خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ان مقبوضات میں تو جو ہمارے مقروض ہیں۔ ناقابل بیان مصیبت محسوس ہو رہی ہے۔

باب دوئم

سلطنت سے دیہات کی سرکشی

ہیں گجرات کے دیہات میں پانچ روز رہا۔ ان دنوں کا مشاہدہ نہایت قابل یادگار ہے۔ اور میرے قیام ہند کا سب سے زیادہ رنج دہ بھی یہی ہے۔ اِن واقعات کے متعلق کوئی شخص خواہ کیسے ہی ٹھنڈے دل سے خیال کرے۔ اور شانتی کے ساتھ اُن کو قلمبند کرے۔ لیکن وہ خود بخود ڈرامے کی شکل میں پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہاں قومی تحریک پورے اوج کمال پر تھی۔ اور ہمیں یہ پتہ لگتا تھا۔ کہ لوگوں کی عقیدت کس قدر زبردست ہے۔ اور وہ کس حد تک مصائب برداشت کر سکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کو یہاں بدترین کارروائیاں کرنی پڑیں۔ کیونکہ وہ ٹیکس وصول کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ جس کے دینے سے کاشتکار انکاری تھے۔ وصولی ٹیکس کے لئے حد درجے جسمانی سختیاں کی گئیں۔ اور قانون کو بالائے

طاق پر رکھ دیا گیا۔ ان باتوں کا میں ہرگز یقین نہ کرتا۔ اگر خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتا۔ ہندوستانی پولیس کی کارروائیاں دیکھنے والوں کی منظر کے اعتبار سے مختلف نظر آتی ہیں۔ اگر انہیں حکام کی نظر سے دیکھیں تو پولیس اعتماد اور وفاداری کا ایک نمونہ ہے۔ سخاوت اور جرائم کی بیخکنی میں وہ نہایت پرجوش ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی نظر سے دیکھو اور اس پانچ دن کے عرصے میں میں ہندوستانیوں کے درمیان رہا۔ تو یہ ہمارے انتظام حکومت پر نہایت ہی بدنما دھبہ ہے مختصر یہ کہ پولیس عام طور پر راشی ہے۔ وہ رشوت زبردستی بھی حاصل کر لیتی ہے۔ انگریز بھی جب کھلے دل سے بات چیت کریں۔ تو اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی پولیس اور افسر دونوں ہی رشوت لیتے ہیں۔

ہم سابق فاتحین کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور ہمارا انتظام حکومت جب ہندوستانی اہلکاروں کے ہاتھوں سرانجام دیا جاتا ہے تو وہ مغلوں کے زمانے کی روایات اور ہمارے یورپین معیار کے مابین ایک قسم کا راضی نامہ ہے۔ ہندوستانی ماتحت افسروں کی نگرانی کرنا آسان نہیں۔ جو انگریز افسروں اور عوام الناس کے مابین قایل ہیں۔ ہندوستانی آبادی کو جس نے بہت سے مطلق العنان حکمران دیکھے ہیں۔ تجربے نے یہ سبق سکھلایا ہے۔ کہ وہ ہر قسم کے ظلم کو خاموشی سے برداشت کر لے۔

مسٹر ونسنٹ اے سمتھ سی۔ آئی۔ ای کی مصنفہ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ میں نے حرف بحرف صحیح پایا۔ اس تاریخ کے صفحہ ۷۰ میں درج ہے۔ کہ جب مسٹر سمتھ ہندوستان میں ایک سرکاری افسر تھا۔ تو وہ لکھتا ہے۔ کہ میرے لئے یہ امر نہایت مشکل تھا

کہ ہندوستانی پولیس کو اقبال جرم حاصل کرنے کی غرض سے ملزموں پر تشدد کرنے سے باز رکھوں۔ اسی کتاب کے صفحہ ۴۰۵ پر مذکور ہے کہ معمولی ٹیکس کے لئے زمانہ حال تک مار پیٹ کرنا ایک معمولی بات تھی۔

مہاتما گاندھی نے جو گورنمنٹ کی مزاحمت میں درجہ بدرجہ ترقی کی۔ ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کرنا اس تحریک کا درجہ کمال تھا۔ اگر یہ تحریک عام ہو جائے۔ تو برطانوی حکومت کا بہت جلد خاتمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس تحریک پر عمل کرتے ہیں۔ اُن میں یہ حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ کہ اپنی مکمل مالی بربادی برداشت کرنے کو مستعد ہوں۔ گورنمنٹ ہند نے جب کاشتکاروں کی اراضیات ضبط کیں۔ اور اُن کی جائیداد منقولہ کو قرق کیا۔ تو اُس سے کچھ زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا۔ جس قدر ٹیکس کسی کاشتکار کے ذمے تھا۔ اُس سے بدرجہا زیادہ قیمت کی چیزیں قرق کر لی گئیں۔ گویا کہ جو شخص لگان اراضی ادا کرنے سے انکار کرے۔ اُسے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ گجرات میں جس زمین کی قیمت سات سو سے لے کر ہزار روپیہ فی بیگھہ تک تھی۔ وہ ایک دو روپے میں نیلام کر دی گئی۔ دو نئے موٹر پمپ جن کی قیمت پانچ پانچ ہزار روپے تھی۔ اور جو آبپاشی کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ ۱۶ روپے اور ۵۶ روپے کو فروخت کر دئے گئے۔ کیونکہ اسی قدر ٹیکس ان لوگوں سے وصول کرنا تھا۔ یہ امر کہ گجرات کے ہزارہا کسان اس قسم کی جوکھم اٹھا لینے کے لئے مستعد تھے۔ اُن کے عزم بالجزم کا کافی ثبوت ہے۔ ستیہ آگرہ کے اس زبردست اور نیا گک کے طریقے کو گجرات میں جاری کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پنجاب کے بعض حصوں کی طرح یہاں کے دیہات نہایت خوشحال ہیں۔ اور اکثر

کاشتکاروں کی اپنی زمینیں ہیں۔ اور اگرچہ وہ نہایت حلیم الطبع لوگ ہیں لیکن اُن میں اعلیٰ درجے کی کاشتکاروں کی خودداری اور عبد پائی جاتی ہے۔ دُوسرے مقامات کے مقابلہ میں یہاں تعلیم کم ہے۔ یہاں کے اکثر دیہاتیوں نے باہر کی دُنیا دیکھی ہے۔ کیونکہ اِس علاقے کے ساحل پر بعض وہ لوگ آباد ہیں۔ کہ جن کا موروثی پیشہ ملاحی تھا۔ اور بہت سے کاشتکار ایسے ہیں۔ جو جنوبی افریقہ کو گئے تھے۔ اور بڑی بڑی رقمیں ہر سال اپنے گھر بھیجتے رہے ہیں۔ میں نے سُنا۔ کہ وہ بحساب اوسط ۵۰ پونڈ سالانہ بھیجتے تھے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ اور نہری آبپاشی کے ذریعے کپاس تمباکو اور نیشکر اور ہر قسم کے غلوں کی خوب پیداوار ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک ایک کاشتکار کے حصّے میں دس یا بیس ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہے۔ لیکن وہ خوشحال ہیں۔ بجائے کچی جھونپڑیوں کے وہاں پختہ مکانات نظر آتے ہیں۔ جو عموماً دو منزلہ ہوتے ہیں۔ جن کے دروازوں پر نقش و نگار کندہ کئے جاتے ہیں۔ اور دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں کھچی ہوئی ہیں۔ کہ ایک دیوار پر کرشن لیلا ہے۔ تو اُس کے سامنے کی دیوار پر ریلوے انجن کی تصویر کھچی ہوئی ہے۔ وہ اپنے مویشیوں پر فخر کرسکتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو۔ کہ ہندوستان کے بیل کیسے شاندار اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ تو اُسے گجرات جانا چاہیئے۔ لیکن اب یہ خوشحالی داستانِ پارینہ ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ پیداوار کی قیمت گر جانے سے یہاں بھی مصیبت کا سامنا ہے۔

کئی سال سے یہ دیہات مہاتما گاندھی اور اُن کے چیلوں کے زیر اثر تھے۔ اُن میں سے بعض میں اُن کے مستقل مرکز تھے۔ جن میں سے اکثر ضبط ہو چکے ہیں۔ مہاتما جی نے قائم کئے تھے۔ یہاں چھوٹے لڑکوں کے لئے

ایک مدرسہ ہے (جو ابھی تک جاری ہے) ایک مدرسہ پسماندہ خانہ بدوش قبیلے کے لئے ہے۔ اور ایک صنعتی مدرسہ ہے۔ جہاں سوت کاتنا اور کپڑا بننا سکھایا جاتا ہے۔ دو سال گذرے۔ علاقہ باردولی نے ٹیکس ادا کرنے کا پہلا تجربہ کیا تھا یہ کارروائی کسی سیاسی مقصد سے نہ تھی۔ بلکہ اس امر کے خلاف تھی۔ کہ نئے بندوبست نے ان پر مالیہ ناواجب طور پر بڑھا دیا تھا۔ باردولی کے کسان آخر تک ڈٹے رہے۔ اور فتحیاب ہوئے۔ آخر کار لگان کم کر دیا گیا۔

آخری بات یہ ہے۔ کہ مہاتما گاندھی جو ہر جگہ سنت خیال کئے جاتے ہیں اس علاقے میں وہ ان دیہات کے مہاپُرش اور گورو ہیں۔ مہاتما جی نے اس علاقے میں اکثر دورہ کیا ہے۔ اور لیکچر دئے ہیں۔ اور جب نمک سازی کے لئے سمندر کی طرف کوچ کیا تھا۔ تو انہوں نے یہیں سے گرفتار ہونا پسند کیا تھا یہاں کے لوگ مہاتما جی کے بھگت ہیں۔ اور ایسے ہی ان کے لفٹنٹ ولبھ بھائی پٹیل سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے بہت سی دیہاتیوں کے ایک گروہ سے یہ سوال کیا۔ کہ وہ یہ تمام ... اور تکلیفیں کیوں اٹھاتے ہیں۔ حسب دستور پہلے عورتوں نے جواب دیا۔ اور مہاتما جی کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ... اور ولبھ بھائی اجازت نہ دینگے۔ ہم ہرگز ٹیکس ادا نہ کرینگے۔ ... باردولی نے اپنے خیالات مجتمع کر کے اپنی اقتصادی تکالیف کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم ٹیکس اس لئے ادا نہیں کرتے۔ کہ یہ ناواجب ہیں۔ اور بیان کیا کہ موجودہ قیمتوں پر اگر ہم اپنی پیداوار فروخت کریں۔ تو ہم کو ... کام کرنے والے مزدوروں کے برابر بھی آمدنی نہیں ہو سکتی۔ آخر میں انہوں نے کہا۔ کہ ہم ٹیکس اس لئے نہیں دیتے۔ کہ ہم سوراجیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جو کچھ ان لوگوں نے کیا۔ اس کا یقین آنا مشکل ہے۔ تب سے دیہات بالکل خالی ہو گئے۔ دریچوں سے جھانک کر دیکھا جا سکتا تھا۔ کہ مکانوں میں سے ہر قسم کی چیزیں اُٹھا کر لے جائی گئی ہیں۔ خاموش گلیوں میں کوئی شخص چلتا پھرتا نظر نہ آیا۔ صرف ایک چھت پر سے ایک بندر کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اِدھر اُدھر کہیں کسان نظر آ جاتا تھا۔ جو اپنے کھیتوں میں ہل چلانے کی غرض سے آیا ہو۔ یا کوئی پجاری جو مندر کی حفاظت کر رہا ہو۔ باقی سب لوگ برطانوی ہند کی سرحد سے گزر کر ریاست بڑودہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں اُنہوں نے سرحد پر چٹائیوں اور آم کے پتوں سے جھونپڑیاں بنا لی تھیں۔ وہ زمین پر سوتے تھے۔ گھڑوں اور بڑے بڑے ٹوکروں میں اُن کے اناج رکھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مشقت پسند دیہاتیوں کے لیئے موسم خزاں میں زندگی گذار لینا چنداں مشکل نہ تھا۔ لیکن برسات کا موسم اُن کے عزم بالجزم کا امتحان کریگا۔

ان کیمپوں میں کس قدر آدمی رہتے تھے۔ جن میں سے میں نے تین کا معائنہ کیا۔ شائد کوئی خیال کرے۔ کہ صرف تین کیمپ تھے۔ نہیں۔ ایسے پانچ اَور کیمپ تھے۔ بڑودہ میں بھی یہ پناہ گزین ہمیشہ محفوظ نہ تھے۔ اُن کے کیمپوں پر کئی بار حملہ کیا گیا۔ اور برطانوی ہند کی پولیس نے مہاراجہ بڑودہ کے علاقے میں ایک ہندوستانی افسر کی ماتحتی میں جا کر سختیاں کیں۔ انہیں لاٹھیوں سے کوٹا۔ اور نہ صرف ان جلاوطن کسانوں کو بلکہ بڑودہ کی رعایا کے آدمیوں کو بھی زدوکوب کیا گیا۔

اِس تحریک کا جواب بڑی سفاکی سے دیا گیا۔ اور انگریز افسر نے جو پولیس کو ہدایتیں دیتا تھا۔ قانون کو اِس طور پر برتا۔ کہ وہ شکست ہونے کی حد تک

پہنچ گیا۔ لگان اراضی دو قسطوں میں عموماً جنوری اور مئی میں وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر فصل دیر میں تیار ہو۔ تو ادائیگی کی تاریخ بڑھا دی جاتی ہے ضابطے کی اس رحمناک دفعہ کا کمشنر نے یہ فائدہ اُٹھایا۔ کہ جو قسط جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں واجب الادا تھی۔ اُس کو پہلے ہی وصول کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء میں لگان کی طلبی کے پروانے جاری کئے۔ اور ماہ اکتوبر میں ہی آئندہ سال کا ٹیکس وصول کرنے کے لئے پولیس نے کسانوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا جو سال رواں کے متعلق دو قسطیں ادا کر چکے تھے۔ کمشنر نے مجھ سے بیان کیا کہ لگان اس لئے جلدی وصول کیا گیا۔ کہ یہ معلوم تھا۔ کہ کاشتکار لوگ ادائیگی میں مزاحمت کرینگے۔ اور یہ بات ضروری تھی۔ کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی فصلیں فروخت کریں۔ یا غلہ اُٹھا کر لے جائیں۔ ٹیکس اُن سے وصول کر لیا جائے۔ کمشنر نے بیان کیا۔ کہ اُس شخص کو تنگ نہیں کیا جائیگا۔ جو مفلسی کی وجہ سے لگان ادا کرنے کے ناقابل ہو۔ غرضیکہ اُن دیہات کے خلاف یہ حملہ کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اب تک قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ وہ بے چین ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف دہشت ناکی کا حربہ استعمال کیا گیا

ضبط شدہ اراضی اور مویشیوں کی نیلامی کے لئے خریداروں کا ملنا آسان نہ تھا۔ یہاں کی آبادی حیرت انگیز حد تک متحد ہے۔ کیونکہ گجرات میں مسلمان بہت تھوڑے ہیں۔ وہ ہندوؤں میں باہم بڑا اتحاد ہے۔ ضلع کیرا میں اکثر مالکان اراضی پٹی دار ہیں۔ اس ذات کے دو ممبروں نے بیرحمانہ مار پیٹ سے تنگ آ کر اپنے ٹیکس جبکہ وہ واجب الادا تھے بجائے معینہ بعد پہلے ادا کر دئے۔ اُن کی برادری والوں نے ایک جلسہ کیا اور ان دونوں شخصوں پر اُن کی غداری کی بنا پر بھاری جرمانہ کیا۔ اور اعلان کر دیا۔ کہ جو شخص آئندہ ایسا کریگا

کمزوری دکھائیگا۔ اُس سے ۱۰۱ روپیہ ڈنڈ لیا جائیگا۔ اگر کوئی یہ جرمانہ ادا نہ کرے۔ تو وہ برادری سے خارج کر دیا جائے گا۔

ایسی سوسائٹی میں کوئی خود دار ہندو ضبط شدہ اراضی نہیں خرید سکتا تھا۔ ضلع کیرا میں ایک نیچ ذات کے خانہ بدوش لوگ آباد ہیں۔ جنہیں بارہ کہتے ہیں۔ رپورٹ مردم شماری میں انہیں جرائم پیشہ قبیلہ لکھا گیا ہے۔ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ وہ صرف مزدوری کرتے ہیں۔ اُن کو دن میں دو مرتبہ گاؤں کے چوکیدار کے پاس جا کر حاضری دینی ہوتی ہے۔ اگر زمین کی قیمت کم ہوتی۔ تو شاید یہ لوگ خرید لیتے۔ کمشنر نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ وہ اس قبیلے کے آدمیوں کی حیثیت بلند کرنا چاہتا ہے۔ کسی کی نیت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نتیجہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ چال کارگر ہو جاتی۔ تو ہندوؤں کے درمیان نفاق پیدا ہو جاتا۔ اور اس تفریق سے حکومت کا کام آسان ہو جاتا۔ وہ شاید ٹیکس وصول کر لیتی۔ مگر گاؤں میں ہمیشہ کے لئے دشمنی کی بنیاد پڑ جاتی۔ اس قسم کی چال کسی انگریز کا ٹھنڈا دماغ ہی تجویز کر سکتا ہے۔ لیکن جب گرم مزاج ہندوستانی افسر اس کو عمل میں لائیں۔ تو وہ نہایت ذلیل پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ ایک ہندوستانی معاملہ دار نے جو گریجویٹ تھا۔ اور غیر معمولی طور پر پھرتیلا آدمی تھا۔ اُس نے اس تجویز کا کچھ اور ہی مطلب سمجھا۔ اُس نے روسی کمیونسٹوں کی طرح دیہات میں جماعتی جنگ کی بنیاد ڈالنی چاہی۔ وہ دیہات میں گیا اور بار بار لوگوں کو جمع کر کے اُن کے سامنے تقریریں کیں۔ اُس کی تقریروں کا خلاصہ مختلف دیہات کے پانچ باریاؤں نے بتایا تھا۔ اُس نے اُن سے کہا تھا۔ کہ پٹی دار تمہیں ستاتے رہے ہیں۔ یہ اُن سے انتقام لینے کا وقت ہے۔ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پٹی دار کا مقروض

ہے۔ تو اُس کے لئے یہ کافی ہے۔ کہ عدالت میں آکر دیوالے کی درخواست دیدے
میں وہاں موجود ہونگا۔ اور فوراً دیوالہ منظور کرادونگا۔ اگر کوئی پٹی دار اپنے قرضے
کا مُطالبہ کرے۔ تو اُسے مار دو۔ اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ جو کوئی شخص
گاندھی ٹوپی پہنے نظر آئے۔ اُسے پیٹو۔ اِن باتوں کے بعد اُس نے کہا۔ کہ
پٹی داروں کی ضبط شدہ زمینیں۔ وہ نیلام میں ایک دو روپیہ ایکڑ پر خرید سکتے ہیں
ایک باریا نے یہ بھی بیان کیا۔ کہ مالمتدار نے ہم سے یہ بھی کہا تھا۔ کہ پٹی داروں
کے مکانات جلادو۔ دُوسرے باریا نے بیان کیا۔ کہ ایک تھانیدار نے بھی ایسا
ہی کہا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ (اگرچہ یہ میرے وہاں سے آنے کے بعد کا
واقعہ ہے) کہ دراصل چند مکانات جلائے بھی گئے تھے۔

اِس کارروائی کے علاوہ ان باغی دیہات میں پولیس کی طرف سے تعزیری
مہمیں بھی بھیجی جاتی تھیں۔ اِن مہمات کا اعلیٰ افسر عموماً وہی مالمتدار ہوتا تھا۔ یہ
مسلح پولیس تھی۔ جس کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں۔ اُن کی وردی پر کوئی نمبر
لگا ہُوا نہیں ہوتا تھا۔ اِن میں سے ایک پولیسمن نے ایک دفعہ بندوق پر سنگین
چڑھاتے ہُوئے سڑک پر میرا راستہ روک لیا تھا۔ لیکن نمبر کے بغیر کسی پولیسمین
کا شناخت کرنا مُشکل ہے۔ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد پولیس والوں کا
طرزِ عمل عموماً یہ ہوتا تھا۔ کہ جس قدر آدمی گاؤں میں رہ گئے ہوں۔ یا کھیتوں میں کام
کرنے آئے ہوں۔ انہیں گھیر لائیں۔ انہیں بے تحاشہ پیٹا جاتا تھا۔ اور یہ کارروائی
اکثر افسر کی موجودگی میں ہوتی تھی۔ اور بعض دفعہ یہ افسر بھی انتقام کی کارروائی
کو تیز کرنے کے لئے خود اپنی چھڑی سے گاؤں والوں کو زدوکوب کیا کرتا تھا۔ بعض
لوگوں کو سخت چوٹیں آئیں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ کہ اُس کا ہاتھ ٹوٹ کر
بیکار ہو گیا تھا۔ اور ایک دوسرے شخص کے انگوٹھے کا جوڑ ہڈی تک اُتر گیا تھا۔

ایک عورت کے بہت سی خراشیں آئی تھیں۔ اور اُس کا مُنہ سوجا ہوا تھا۔ میں نے اِس سے بھی زیادہ سنگین ضربات کا حال سُنا۔ مگر یہ لوگ ایک ہاسپٹل میں چلے گئے تھے۔ جو دُور فاصلے پر تھا۔ میں نے کئی دیہات میں دورہ کیا۔ اور کسانوں نے حال کی مار پیٹ کے متعلق اپنے ذاتی تجربات سُنائے۔ اِن میں سے دو شخص کے زخم میں نے دیکھے۔ بعض ایسے تھے۔ جن کے تمام جسم پر خراشیں تھیں۔ جو بعض لاٹھیوں سے اور بعض بندوقوں کے کندوں سے پیدا ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ اِس مار پیٹ کا مقصد یہ تھا۔ کہ لگان اُسی وقت وصول کر لیا جائے۔

بعض جگہ یہ طریقہ کامیاب رہا۔ لیکن عموماً ایسا ہوتا تھا۔ کہ جس شخص کو زدوکوب کیا جاتا۔ اُس کے ذمّہ کوئی ٹیکس واجب الوصول نہ ہوتا تھا۔ باردولی میں ایک پولیس افسر نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ جو شخص بھی نظر آ جائے۔ اُس سے مطالبہ کیا جاتا تھا۔ کہ وہ کسی دُوسرے شخص کا ٹیکس ادا کرے۔ جو پولیس کی پہنچ سے باہر تھا۔ اُسے لاٹھی یا ٹھوکر لگائی جاتی تھی۔ اور حکم دیا جاتا تھا۔ کہ کسی پڑوسی سے روپیہ لیکر ٹیکس ادا کرے۔

۱ اِس مار پیٹ کا مقصد عام طور پر لوگوں کو مرعوب کرنا تھا۔ دو شخصوں کو اُس وقت تک پیٹا گیا۔ جب تک اُنہوں نے گاندھی ٹوپی سر سے نہ اُتار لی۔ ایک گاؤں سے پولیس نے درختوں اور مکانوں سے قومی جھنڈا اُتار کر پھاڑ ڈالے اور آٹھ آدمیوں کو زدوکوب کیا۔ ایک آدمی کے جسم پر بندوق کے کُندے کا بہت بڑا زخم تھا۔ اور بارہ نشانات لاٹھیوں کی ضربات کے تھے۔ اُس سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ پولیس کو سات بار سلام کرے۔ اُس سے سلام کرا کر پیٹا چھوڑا گیا۔

ناظرین کا ممکن ہے یہ خیال ہو۔ کہ شاید بعض ہندوستانیوں نے مجھے گمراہ کر دیا ہے۔ لیکن ایک موقعہ پر ایک گاؤں میں کمشنر بھی میرے ساتھ گیا۔ لوگوں کے زخم اور خراشیں خود اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھیں کمشنر نے نو زخمیوں میں سے صرف ایک زخمی کی صداقت کے بابت اپنا شک ظاہر کیا۔ اور وہ ایک لڑکی تھی۔ جس نے حیا کی وجہ سے اپنے زخم نہیں دکھلائے۔ میں دو ہندوستانی افسروں سے بھی ملا۔ اور اُن کے متشددانہ طریقوں کو دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے میری موجودگی میں ایک ہجوم پر بلا ضرورت لاٹھیوں سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جو محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گیا تھا۔ وہ لوگ اُس کا حکم سنتے ہی بھاگ گئے۔ تاہم تعاقب کر کے اُن پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ میں نے ناموں اور تاریخوں کے ساتھ مقامی حکام کے سامنے اپنی تحریری شہادت پیش کی۔ نیز دہلی کے اعلیٰ حکام کے سامنے۔ اپنا تحریری بیان دیا۔

کوئی شخص اپنی آنکھوں پر ہی اعتبار کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے بورسد جیل میں اٹھارہ سیاسی زیر تجویز قیدیوں کو دیکھا۔ جو رات دن ایک پنجرے میں بند رکھے جاتے تھے۔ اُس کے ایک طرف لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ جیسی کہ چڑیا گھر میں ہوتی ہیں۔ یہ پنجرہ تیس فٹ مربع تھا۔ وارڈر نے مجھے بتایا۔ کہ انہیں ایک دن میں رفع حاجت اور ہاتھ منہ دھونے کے لئے صرف پون گھنٹہ کے لئے باہر نکالا جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک قیدی نے کتابوں کے مطالعہ یا کسی کام کے بغیر چھ ہفتے اِس پنجرے میں بسر کئے اور وارڈر نے اِس امر کی صداقت سے انکار نہیں کیا۔ جب ایک دوسرے قیدی نے

مجھ سے بیان کیا۔ کہ مجھے اور میرے ایک ساتھی کو معاملتدار کی موجودگی میں جیل کے اندر زدوکوب کیا گیا ہے۔ تو مجھے اُسے ملامت کرنی چاہئے تھی۔ کہ وہ بادشاہ سلامت کے ایک افسر پر غلط الزام لگا رہا ہے۔ لیکن اس قعر تزاحم میں میں صُمٌّ بُکمٌ رہ گیا۔

بہت سے مرد اور عورتوں کو کانگرس میں حصہ لینے کے قصور میں جیل میں ڈالا گیا۔ اُن کی تعداد ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ اُن میں سے بعض کو ایسی عمارتوں میں رکھا گیا۔ جو درا صل جیلخانے نہیں تھے۔ قیدیوں کو مجسٹریٹ کے خیال کے مطابق اُن کی حیثیت کے لحاظ سے اے۔ بی اور سی کلاسوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ تقسیم نہایت بے پرواہی سے کیجاتی تھی۔ مہاتما گاندھی کے تین لڑکے بھی جیل میں گئے۔ اور اُن میں سے ہر ایک کو مختلف کلاس دیگئی۔

متوفی انسپکٹر جنرل جیلخانجات بنگال نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ حکام کا خیال یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو سی کلاس دیجاتی ہے۔ وہ قلیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اُن کو اس حال میں رکھا جاتا ہے۔ جس میں وہ اپنے گھروں میں رہنے کے عادی ہیں۔ میں نے کلکتے میں ہزدیک دم دم کے جیلخانے کو دیکھا۔ جو پہلے اسلحہ خانہ تھا۔ یہ مقام ملیریا کا گھر ہے۔ اور جیلخانے کے اندر مچھر بڑی کثرت سے تھے۔ لیکن جیل کے ذمہ وار ہندوستانی افسر معقول آدمی تھے۔ اور وہ حتی المقدور قیدیوں کی ہر ایک شکایت کو رفع کرتے تھے۔ اور وہاں کوئی تنہائی کا انتظام نہ تھا۔ تاہم سی کلاس قیدیوں کی حالت افسوسناک تھی۔ یہ قیدی سب تعلیم یافتہ جماعت کے آدمی تھے۔ اور اُن میں سے اکثر انگریزی بول سکتے تھے۔ اُن میں سے اکثر

کلرک تھے۔ لیکن وکیل اور ڈاکٹر بھی اُن میں شامل تھے۔ مگر جیلخانہ کی جگہ نہایت ہی گندی تھی۔ وہ پیداوار نہ تھی۔ اور حشرات الارض کی وہاں کثرت تھی۔ کھانا خراب ملتا تھا۔ اور ہمیشہ ایک ہی قسم کا اور غیر کافی۔ نہ تو صابن دیا جاتا تھا نہ تیل جس کے ہندوستانی عادی ہیں۔ اور نہ یہ چیزیں باہر سے منگانے کی اجازت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر قیدی جلدی امراض میں مبتلا ہو گئے۔ سی کلاس قیدیوں کو مچھر دانیاں نہیں دیجاتی تھیں۔ اگرچہ اے کلاس اور بی کلاس والوں کو دیجاتی تھیں۔ آخر کار اکثر قیدی ملیریا میں مبتلا ہو گئے۔ اور ہاسپٹل میں اس قدر ہجوم ہو گیا۔ کہ ایک بستر اور دوسرے بستر کے درمیان چھ انچ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

بابِ سوئم

ہندوستانی دیہاتوں کی زندگی

آج کل اگرچہ انگلینڈ کے لوگ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان کو آسکتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی دیہات کو بالعموم یہ لئے وہی دقیانوسی دوایاں ہیں۔ جو ہزار سال سے بغیر کسی تبدیلی کے چلی آتی ہیں۔ گاؤں میں جا کر دیکھو تو اُن کا منظر عجیب وغریب دکھائی دیگا۔ دیوار کے سایہ کے نیچے کمہار اپنے چاک پر مٹی کے برتن بنا رہا ہے۔ ویسے ہی جیسے کہ ہزار سال پہلے بنتے تھے۔ دہلیز کے اندر دیواروں پر پنجوں سے سرخ رنگ کے نقش ونگار بنے

ہوتے ہیں۔ اِس غرض سے کہ بیماری یا بدقسمتی گھر میں داخل نہ ہونے پائے
ایک عورت زمین پر بیٹھی چرخہ چلا رہی ہے۔ چند آدمی کھلی جگہ میں گنوں کا
رس ایک دستی مشین میں نکال رہے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک دُھنیہ
روئی دُھنک رہا ہے۔ ایک چھوٹے سے شوالے میں بے شکل و صورت کا
ایک پتھر دھرا ہُوا ہے۔ جس کو رولی سے سُرخ بنایا ہُوا ہے۔

یہ لوگ اِس طرح رہتے ہیں۔ جس طرح ہمارے آبا و اجداد زمانہ وحشت
میں رہتے تھے۔ اُن کے کھیت نصف ایکڑ یا اُس سے بھی کم ہوتے ہیں۔ گویا
باغ کی کیاریاں ہیں۔ حد بندیوں کی منڈیریں بنانے میں بہت سی زمین ضایع
ہو جاتی ہے۔ ہل اُسی وضع کے ہیں جیسے کہ آریوں نے جو کلدانیوں کے ہمعصر
تھے۔ وادیٔ سندھ میں تہذیب کی بُنیاد رکھتے ہُوئے ایجاد کئے تھے۔ یہ لکڑی
کے چھوٹے چھوٹے آلے ہوتے ہیں۔ جن میں نوکدار لوہا لگا ہوتا ہے۔ نہریں
کم علاقوں میں واقع ہیں۔ اگر کسی میں مقدور ہو۔ اور پانی سطح زمین سے زیادہ
گہرائی پر نہ ہو۔ تو وہ رہٹ بنا لیتا ہے۔ بعض جگہ دو بیلوں کے ذریعے کنواں
بنا لیتے ہیں۔ فصل کاٹنے کے وقت مشینوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔
لوگ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی درانتیوں سے فصل کاٹتے
ہیں۔ گیہوں کی تخم ریزی کے لئے دس دفعہ ہل چلانا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی
چار انچ سے زیادہ زمین نہیں کھودی جا سکتی۔ زمین کو تین پانی دینے
میں پندرہ دن خرچ ہوتے ہیں۔ اور فصل کاٹنے میں آٹھ مرد اور عورتیں
صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ کہ ایک ایکڑ
گیہوں پیدا کرنے میں ایک آدمی کی ۴۰ دن کی محنت صرف ہوتی ہے۔
ایک سرکاری رپورٹ میں بھی اس کی تصدیق کی گئی ہے۔ اِسی میں

ہندوستان کی مفلسی کا راز مضمر ہے۔ مغربی کسان جو کام مشین کے ذریعے لیا۔
دن سے کم عرصے میں کر سکتا ہے۔ وہ ہندوستان میں چالیس دن میں ہوتا ہے۔
لیکن اگر ہندوستانی کسانوں کو مشینیں دیدی جائیں۔ تو بجز اس کے کہ انہیں
فرصت زیادہ ملجائے۔ انہیں اور کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ پانچ ایکڑ سے
لیکر زیادہ سے زیادہ دس ایکڑ زمین کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر مشینوں کے ذریعے وہ
وقت بچا لیں۔ تو اُن کے پاس اور کوئی کام کرنے کو نہیں ہے۔ آگرے سے تیس
میل کے فاصلے پر کشن پور کے ایک زمیندار نے مجھے بتایا۔ کہ ہم لوگ کاشتکاروں
سے مالیہ وصول کرتے ہیں۔ اُس کا ۵۰ فی صدی حصّہ بطور لگان کے گورنمنٹ کو دیتے
ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ کہ یہ کنوئیں کس نے بنائے ہیں۔ تو اُس نے جواب دیا۔ کہ
یہ بہت عرصے سے بنے ہُوئے ہیں۔ اور کاشتکاروں نے ہی بنائے ہیں۔ اور اپنی
جھونپڑیوں میں بھی خود تعمیر کی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہ آخر زمیندار دیہات کو کیا فائدہ
پُہنچاتے ہیں۔ آخر اِس مالیہ کے عوض میں وہ کسی قسم کی مجلس یا اقتصادی خدمت
سرانجام دیتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ کہ کوئی نہیں۔ ہم اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ جیسا
کہ دُنیا میں ہر ایک اور شخص کرتا ہے۔ ہم نے زمین خریدی ہے۔ کاشتکاروں کے
متعلق ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہے۔

گاؤں کے لوگ جس کنوئیں سے پانی پیتے ہیں۔ اُس کے گرد غلاظت
اور گوبر کے پانچ بڑے بڑے ڈھیر تھے کچے مکانوں کے بیچ میں تنگ گلیوں
میں نہایت متعفن کیچڑ تھی۔ یہ مکان کچی مٹی کے صندوقوں کے مشابہ تھے۔ جن
میں نہ کوئی کھڑکی تھی۔ نہ چمنی۔ گرمی کے موسم میں لوگ اِن کی چھتوں پر سوتے
ہیں۔

ایک درخت کے نیچے نمبردار نے بانس کی چارپائی میرے لئے ڈال

دی۔ چند منٹ کے اندر گاؤں کی تمام مذکر آبادی میرے گرد زمین پر بیٹھ گئی
گاؤں کے باشندوں کی حالت جاننے کے لیئے تین سوالات کافی تھے۔ اور
باقی سب اُن کی تفصیل ہے۔ ہر شخص مقروض تھا۔ کوئی بھی لکھنا پڑھنا نہیں
جانتا تھا۔ بچوں میں سے ایک بھی مدرسے میں داخل نہیں تھا۔ ہر بچہ مقروض
پیدا ہوتا ہے۔ اور جیتا ہے جلنے تک مقروض رہتا ہے۔ شرح سود ۲ ۳ فیصدی
ہے۔ بنیا سود در سود کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور قرضہ اس طرح بڑھتا
چلا جاتا ہے۔ جس طرح جوا تیم گوبر کے ڈھیر میں جب کسی کسان کی بھینس مر
جاتی ہے۔ تو وہ مہاجن سے قرضہ لیکر اور خرید لیتا ہے۔ اس شرط پر کہ تمام گھی
اُسے دیتا رہیگا۔ گاؤں میں صرف لسی باقی رہ جاتی ہے۔ جو فصل اس قدر
مشقت کے بعد پیدا کیجاتی ہے۔ وہ سب مہاجن کے گودام میں چلی جاتی ہے۔ وہ تمام پیداوار پچھلے
قرضے کے عوض میں وصول کرلیتا ہے۔ اور پھر نئے قرضے کے طور پر دیتا ہے۔ دونوں حالتوں میں
غلے کی قیمت یکساں نہیں ہوتی۔ گیہوں والوں کو شادی کے موقعہ کے سوا گیہوں کھانی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ عموماً
باجرہ یا چنے کھاتے ہیں۔ ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد بچوں کو کبھی دودھ نہیں
ملتا۔ اکثر میں سے گذشتہ آنکھ کی بیماریوں یا دل کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں
اکثر کے پیٹ پھوسے پھولے ہوتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملیریا کی وجہ
سے تلی بڑھی ہوئی ہے۔ میں نے سوال کیا۔ کہ شادیوں پر تم لوگ کیا خرچ کرتے
ہو۔ تو ایک شخص نے جواب دیا۔ کہ میں ۱۴ پونڈ قرض لونگا۔ جس شخص کی یومیہ
آمدنی ۲ پنس کے قریب ہو۔ اُس کے لیئے شادی پر اس قدر خرچ کرنا بیحد
فضول خرچی ہے۔ لیکن شادیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اور گاؤں زیادہ مفلس
ہوتا جاتا ہے۔ دیہاتوں نے مجھ سے کہا۔ کہ ہم سے آج تک کسی صاحب نے
اس قسم کے سوالات نہیں کئے تھے۔ کلکٹر صاحب نے ہم سے کبھی نہیں

پوچھا تھا۔ کہ تم کیا کھاتے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ کہ وہ تم سے کیا پوچھتا ہے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ وہ یہ سوال کرتا ہے۔ کہ دیہات میں کس قدر جرایم ہوئے ہیں۔ اور کیا حال میں کوئی ڈاکہ پڑا ہے۔ میرے میزبان نے جو ایک برہمن تھا۔ اور خاص قابلیت کا آدمی تھا۔ جس نے کالج میں تعلیم پائی تھی۔ لیکن اب گاؤں میں کھیتی باڑی کا کام کرنے لگا تھا۔ کسانوں سے پوچھا۔ کہ کیا کسی کے پاس لالٹین ہے۔ کیونکہ ہم نے اندھیرے میں واپس جانا ہے۔ لیکن کشن پورہ میں کسی گھر میں بھی کوئی لیٹن نہ تھی۔

دیہات میں زیادہ عرصہ رہنے سے مجھے دیہاتیوں کی زندگی کے مزید حالات معلوم ہوئے۔ ایک بڑے درخت کے نیچے ایک جولا ہے نے اپنا تانا بن رکھا تھا۔ اور کونچی سے اس کے تار درست کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اور ایک چھوٹا لڑکا اس کی مدد کرتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک سود خوار مہاجن نے اس کو دھمکانا شروع کیا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے بغیر کسی ندامت محسوس کرنے کے بیان کیا۔ کہ میں ۷۵ فیصدی سود لیتا ہوں۔ میں نے پوچھا۔ کہ چونکہ اس کی شرح سود اس قدر زیادہ ہے۔ کیا کبھی اس کا کوئی قرضہ مارا گیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ کہ نہیں۔ اور کہا۔ کہ موجودہ تہذیب کے زمانے سے پہلے کبھی کوئی قرضہ مارا نہیں گیا۔ جولاہا مختلف مہاجنوں کا ۲۰۰ روپے کا مقروض تھا۔ وہ ۹ گز کھدر روزانہ بنا کرتا تھا۔ اور ۹ آنے روز پیدا کرتا تھا۔ یعنی اگر وہ سال میں ۳۰۰ دن کام کرے۔ تو ۹ پونڈ سے زیادہ نہیں کما سکتا تھا۔

دیہاتی زندگی کے متعلق اپنے سابقہ احساس پر میں نے نظر ثانی کی۔ دیہات صرف اس کو نہیں کہتے۔ جہاں کچے مکانات ہوں۔ بلکہ ان کا تعلق باہر کی دنیا سے بھی ہے۔ وہاں مہاجن اپنا سود اور زمیندار اپنا مالیہ وصول کرنے

آتا ہے اور اُن دونوں کے پس پشت گورنمنٹ کی عدالتیں اور پولیس موجود ہے
کاشتکاروں کو جس قدر مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اُسے دیکھ کر میرے ہوش
اُڑ گئے۔ اُن دیہات میں دو قسم کے کاشتکار ہیں۔ ایک موروثی حقوق رکھتے ہیں
جو مقابلتاً کم مالیہ ادا کرتے ہیں۔ یعنی پانچ روپے دس آنے فی ایکڑ۔ اُن کے باہمی
مقابلے کی وجہ سے بعض حالتوں میں مالیہ دس روپے سے تیس روپے ایکڑ
تک جا پہنچا ہے۔ ہندوستانی کسان ایک ایکڑ زمین سے لے کر آٹھ من تک
غلہ پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ میں نے سنا ہے۔ کہ پنجابی کسان بارہ من تک پیدا کر
لیتے ہیں۔ آٹھ من کی قیمت سولہ روپے ہوئی۔ اِس کے علاوہ تھوڑی بچ رہتی ہے
لیکن سُود خوار جو مقامی تاجر بھی ہوتا ہے۔ بازار کے نرخ سے قیمت کم دیتا ہے
امسال گذشتہ سال کی نسبت قیمتیں کم ہیں۔ لیکن مالیہ جوں کا توں ہے۔ اب یہ
ایک تفریق کا سوال ہے۔ کہ جس کاشتکار نے سولہ روپے میں سے تیس روپے
مالیہ ادا کیا ہے۔ اُس کے پاس کیا باقی بچا۔؟ اور جو دس روپے مالیہ دیتے ہیں
جب انہوں نے ۶ روپے کا غلہ تخم ریزی کے لئے رکھ لیا۔ اور کچھ بیلوں کو دانہ کھلایا
تو دیکھنا چاہئے۔ کہ ان کو کیا فایدہ رہا۔ ہفتوں تک میرا یہ خیال رہا۔ کہ شاید کاشتکار
غلط بیانی کر رہے ہیں۔ میں ہرگز اُن کا اعتبار نہ کرتا۔ اگر سرکاری رپورٹ میں اِس
کی تصدیق نہ دیکھتا۔ پنجاب کی حالت مقابلتاً بہتر ہے۔ لیکن وہاں بھی کاشتکاروں
کی روزانہ آمدنی ۴ پیسے سے کم ہے۔ صرف یہی نہیں۔ کہ مالیہ زیادہ ہے۔ بلکہ
کاشتکار زمیندار کے پنجے میں بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اِس میں شک نہیں
کہ قانون یہ ہے۔ کہ کسی مزارعہ کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ اُس نے
مالیہ ادا نہ کیا ہو۔ اور مالیہ بیس سال میں صرف ایک دفعہ بڑھایا جا سکتا ہے۔
اور اُس کے خلاف عدالت میں اپیل ہو سکتی ہے۔ لیکن مالیہ کی رسید دینے کا

رواج نہیں ہے۔ اور کاشتکاروں نے مجھے بتایا۔ کہ زمیندار ہمیشہ یہ چالاکی کرتے ہیں۔ کہ کچھ نہ کچھ مالیہ ہمیشہ بقایا میں لکھتے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین نہ آیا اور کہا۔ کہ کوئی مثال پیش کرو۔ وہ ایک بیوہ عورت کو لائے۔ اس نے ۲ سال میں ۲۱۰ روپے مالیہ ادا کیا تھا۔ لیکن ۲ روپے اس کے ذمے باقی تھے۔ اس لئے سرکاری رجسٹر میں اس کی وصولی درج نہیں کی گئی تھی۔ اس کے پاس کوئی رسید نہ تھی اور اسے بیدخلی کا نوٹس مل چکا تھا۔ جو زمیندار اس گاؤں کا مالک تھا۔ وہ بھی کسانوں کے حلقے میں بیٹھا تھا۔ وہ اس واقعہ کی حقیقت سے انکار نہ کرسکا۔ میں نے ایک دوسرے زمیندار سے پوچھا۔ کہ تمہارے ہمسائے کے اس قدر ظلم کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا۔ کہ جب شیر بھوکا ہوتا ہے۔ تو وہ کسی جانور پر رحم نہیں کرتا۔ میرے ہمسائے کی زمین رہن ہے۔ اسے اپنی حیثیت بھی قایم رکھنی ہے۔ اسے گورنمنٹ کا وفادار رہنا ضروری ہے۔ آج کل روپیہ مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ اس لئے اسے ظلم کرنا پڑتا ہے۔

یہ زمیندار جو پرانے زمانے کے جاگیرداروں کی طرح نہیں ہیں۔ کاشتکاروں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ وہ کاشتکاروں کو کہلا بھیجتے ہیں۔ کہ اپنے بیلوں کی جوڑی لاکر ہمارا کھیت جوت جاؤ۔ اور جب ان کے ہاں کوئی دعوت ہوتی ہے۔ تو کاشتکاروں کو دودھ اور چارہ دینا پڑتا ہے۔

آدھا مالیہ زمیندار لے جاتا ہے۔ باقی سرکار کے خزانے میں جاتا ہے لیکن وہ اس کے عوض کیا دیتے ہیں۔ اس گاؤں میں ایک مدرسہ تھا۔ جو ایک [illegible] واقع تھا۔ جس میں دو کمرے تھے اور ایک [illegible] آمدہ۔ یہ ایک گندا مکان تھا۔ [illegible] صفائی نہیں کی گئی تھی۔ دیواروں میں جابجا دھبے لگے ہوئے تھے۔ اور چٹائی جو فرش کا کام دیتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی تھی۔ دیواروں پر کوئی تصویر نہ تھی۔ دو نقشے لٹک

رہنے تھے۔ مگر اِس قدر پڑانے اور پھٹے ہوئے۔ کہ میں یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ وہ ہندوستان کے ہیں۔ یا انگلینڈ کے۔ مدرسے کے متعلق ایک اچھی بات قابل ذکر یہ ہے۔ کہ منجملہ ۹ ۵ لڑکوں کے ۱۸ دلت جاتیوں کے لڑکے تھے۔ جن میں سے بعض اچھوت بھی تھے۔ میں نے بڑی جماعت کے لڑکوں سے پوچھا۔ کہ اُن کے گھر میں کتنی کتابیں ہیں۔ ۱۴ میں سے دو نے جواب دیا۔ کہ ہمارے ہاں ایک ایک کتاب ہے جس کا نام بھگت مال ہے۔ اور صرف ایک گھر میں ایک ورنیکلر اخبار آتا تھا۔ اِن تمام لڑکوں میں سے صرف پانچ نے کبھی کبھی دودھ پیا تھا۔ حالانکہ مدرسے میں خوشحال گھرانوں کے لڑکے تھے۔ جو ایک آنہ مہینہ فیس دینے کی مقدرت رکھتے تھے ۱۰ لڑکوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑہ کپڑے تھے۔ ایک لڑکے نے فخریہ کہا کہ اس کے پاس چار جوڑے کپڑے ہیں۔ لیکن وہ سُود خوار مہاجن کا لڑکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر میں نے لڑکوں سے جغرافیے کے سوالات کئے۔ کہ انگلینڈ بڑا ملک ہے یا ہندوستان۔ گرمی انگلینڈ میں زیادہ ہوتی ہے۔ یا ہندوستان میں۔ لیکن نصف لڑکوں نے جو جواب دیا۔ دوسرے نصف لڑکوں نے اُس کے خلاف کہا۔ میں مدرسے سے یہ سوچتا ہوا چلا آیا۔ کہ یہ کسان گورنمنٹ ہند کو مالیہ ادا کر کے کیا فایدہ حاصل کرتے ہیں۔

اِن حالات کو پڑھ کر میرا خیال ہے۔ کہ ناظرین مجھ سے یہ سوال کرینگے کہ اُن کی رحمناک زندگی جو حالات تم نے بیان کئے ہیں۔ اگر وہ سچ ہے۔ تو یہ مزدور اور کسان بغاوت کیوں نہیں کرتے۔ ایسا سوال کوئی مغربی دماغ ہی کر سکتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے لئے مجھے چند باتیں بیان کرنی پڑینگی۔ اول یہ کہ غریب سے غریب دیہات میں بھی زندگی ایسی بے لطف نہیں ہے میلے اور تہوار جو قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں۔ برابر ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ

اُس حالت میں بھی ہوتے ہیں۔ جبکہ مالیہ اور لگان ان کے ذمّے باقی ہو۔ مندر میں روزانہ عبادت کرنا بھی ایک قسم کی تفریح ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے۔ کہ ہندوستانی جو حیرت انگیز حد تک متحمل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ نیم فاقہ مستی کی حالت میں رہتے ہیں۔ ایک فوجی افسر نے کہا تھا۔ کہ ہندوستانی رنگروٹوں کو سب سے پہلے کھانا کھانا سکھایا جاتا ہے۔ عام طور پر قُلیوں کی جسمانی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ اگر کوئی اُن کے ٹکّے لگائے۔ تو وہ اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں پنجاب کے سوا عام طور پر ہندوستانی کاشتکاروں کے پٹھّوں کی طاقت یورپین مزدُوروں کی نسبت نِصف ہوتی ہے۔ جن لوگوں کی ملیریا کی وجہ سے تلیاں بڑھی ہُوئی ہوں۔ وہ بغاوت کیا خاک کرینگے !۔

علاوہ ازیں مجلسی رواجوں اور روایات کا اثر بڑا زبردست ہے۔ بچپن سے ہی ہر مرد اور عورت کو اِس قدر ہدایات کی جاتی ہیں۔ کہ ان کے دماغ طاقت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کوشش کرنے سے ہی باغی بن سکتا ہے کیونکہ مضبُوط طبیعت کے آدمیوں میں ہی یہ قابلیت ہو سکتی ہے۔ جنگجو اور حکمران قوموں میں ہی ہمّت اور دلیری ہوتی ہے۔ ایک بڑے قابل ہندو نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ میرا باپ بزُدل تھا۔ میں نیم بزُدل ہوں۔ میرا لڑکا بہادر ہوگا۔ یہ صدیوں تک صبر کے ساتھ مظالم برداشت کرنے کا نتیجہ ہے۔

یہ دُرست ہے۔ کہ شہروں میں ذات پات کی بندشیں ٹوٹ رہی ہیں۔ لیکن ذاتوں کی تقسیم کی وجہ سے عوام میں جو احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ دیر میں زائل ہوگا۔ بمبئی اور کلکتے کے پارچہ بافی کے کارخانوں میں سو ذاتوں کے مزدُور کام کرتے ہیں۔ جن میں اکثر نیچی ذاتوں کے ہیں۔ اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہڑتال کی جاتی ہے۔ تو وہ بڑی مُستعدی اور طاقت برداشت

کا اظہار کرتے ہیں۔

گاندھی جی کی تحریک سے دیہات میں طاقت کا احساس پیدا ہو گیا ہے وہ اب اپنے آپ کو بالکل علیحدہ نہیں سمجھتے۔ بنگال والے سُنتے ہیں۔ کہ گجرات نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اِس لئے وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ صوبجات متحدہ کے گاؤں کشن پور میں بھی میں نے کسانوں سے سیاسی سوالات نہیں کئے۔ لیکن ان میں سے ایک نے سوراجیہ کا ذکر کیا۔ جس پر سب کے چہرے چمک اُٹھے۔ میں نے پوچھا کہ سوراجیہ سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ ؟

کئی ایک نے ایک ساتھ جواب دیا۔ کہ پھر ہمیں برائے نام ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ اُن میں سے اکثر نے مہاتما جی کو دیکھا بھی تھا۔ جبکہ وہ اُن کے علاقے کے قریب سے گذرے تھے۔ میں نے بتایا۔ مہاتما جی فوج کا خرچ اور سرکاری افسروں کی تنخواہیں اور لگان اراضی نصف کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

گجرات کے بعد میں نے الہ آباد کی نواح میں دورہ کیا۔ وہاں در اصل کسانوں کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ کانگرس اُن کی رہنمائی کر رہی ہے۔ گجرات میں عدم ادائیگی کی تحریک کا جاری کرنا آسان تھا۔ کیونکہ وہاں کسانوں کی زمینیں اپنی ہیں۔ مگر دوسری جگہ یہ حالت نہیں ہے۔ چنانچہ بنگال میں کانگرس نے چوکیدارہ ٹیکس ادا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ شمالی اور وسطی ہندوستان میں زمیندار کثرت سے ہیں۔ جو سرکاری لگان مالیہ میں سے ادا کرتے ہیں۔ کانگرس یہ نہیں چاہتی۔ کہ ہندوستانیوں میں جماعتی جنگ شروع ہو جائے۔ لیکن الہ آباد کے گرد و نواح کے کسانوں نے کانگرس سے درخواست کی۔ کہ وہ اُن کی رہنمائی کرے۔ اُنہوں نے عدم ادائیگی ٹیکس کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ جسے در اصل وہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کانگرس نے کچھ

عرصے تک پس و پیش کیا۔ لیکن کسانوں کے زور دینے پر وہ آمادہ ہو گئی۔ ماہِ نومبر میں تحریک شروع ہوئی۔ اور میں وہیں موجود تھا۔ جبکہ الہ آباد میں ایک پریس اس الزام میں ضبط کیا گیا تھا۔ کہ اس نے عدم ادائگی ٹیکس کے اشتہارات چھاپے تھے۔ جنوری میں کسانوں کے مجمع کو گولیوں سے منتشر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

مستقبل قریب کا حال جاننا مشکل ہے۔ لیکن جب میں ہندوستان سے روانہ ہوا۔ تو میرا یہ خیال تھا۔ کہ قومی تحریک نے کروڑوں آدمیوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا ہے۔ اور ان میں ان کی طاقت کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ کانگرس ایک متحدہ جماعت نہیں رہیگی۔ کیونکہ اس میں ایسے مرد اور عورتیں موجود ہیں۔ جو کسی دن کاشتکاروں کی تحریک کے لیڈر بن جائینگے۔ جس وقت ہندوستان قومی کشمکش کی محویت سے فارغ ہوا۔ تو دیہات کے افلاس کے مسئلے پر اس کی توجہ مبذول ہوگی۔

چوتھا باب

غریب ہندوستانی مزدوروں کی زندگی

کسی انگریز سیاح کے لئے جو ہندوستان کی کسی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ یہ جاننا مشکل ہے۔ کہ مفلسی کی زندگی میں ہندوستانیوں کیلئے

کیا گزرتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ ایک لمحہ کے لئے میں نے حقیقی حالت
کا مطالعہ کیا۔ جبکہ میں احمد آباد میں پانی کے ایک نلکے کے پاس کھڑا تھا۔ اس
جگہ پانی خوراک سے بھی زیادہ ضروری چیز ہے۔ اگر کوئی شخص دھوپ میں
دس منٹ کے لئے بھی چلے۔ تو اس کی قمیض پسینہ سے تر ہو جاتی ہے۔
جب تک آدمی دن میں چار دفعہ ٹھنڈے پانی سے نہ نہائے۔ وہ زندہ نہیں
رہ سکتا۔ اس علاقے میں بھینسوں پر رشک آتا ہے۔ جو تالابوں کے اندر
دن بھر پانی میں بیٹھی رہتی ہیں۔ جس نلکے کا میں ذکر کرتا ہوں۔ اس پر مکانات
کی دو لمبی قطاروں میں رہنے والوں کا انحصار تھا۔ کل ۱۵۳ مکانات تھے
جن میں سے ۱۴۰ آباد تھے۔ ہر ایک مکان میں پانچ چھ آدمی رہتے تھے۔
یعنی ۸۰۰ آدمیوں کی ضروریات کے لئے ایک ہی نلکہ تھا۔ یہیں سے وہ
پانی پیتے تھے۔ یہیں نہاتے تھے۔ اور کپڑے دھوتے تھے۔ میں نے پانی
کو چھو کر دیکھا۔ تو وہ شیر گرم نہیں۔ بلکہ خوب گرم تھا۔ اس سے مجھے ہندوستانی
مزدوروں کی زندگی کا حال معلوم ہوا۔ میں دو تین مکانوں میں داخل ہوا۔ ان
کا رقبہ دس یا بارہ فٹ مربع سے زیادہ نہ تھا۔ ان میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ اور ان
میں کبھی ہوا کا گذر نہ ہوا۔ نہ کوئی چمنی تھی۔ اور اپلوں کے دھوئیں کی بو آ رہی تھی
جن سے یہ لوگ ایندھن کا کام لیتے تھے۔ مکانوں کا فرش سڑک کی سطح سے
ایک فٹ نیچا تھا۔ اس لئے برسات کے دنوں میں وہاں پانی کا بھر جانا لازمی تھا
چھتیں کھپریلوں کی تھیں۔ دونوں قطاروں کے مکانوں کی پشت آپس میں
ملتی تھی۔ اور ان کے عقب میں جو تنگ سی گلی تھی۔ وہ متعفن کیچڑ سے لبریز تھی
ہر ایک خاندان کے لئے ایک ہی کمرہ تھا۔ علاوہ برآمدے کے جس میں صرف
ایک آدمی سو سکتا ہے۔ لیکن گرمی کے موسم میں ان مکانوں کے اندر سونا

مشکل ہے۔ بمبئی کے بازاروں میں بھی لوگ رات کے وقت سوتے ہیں کیونکہ اُن کے مکان تنگ وتاریک ہوتے ہیں۔ وہ ایک چٹائی یا بستر ٹالی پر یا پٹڑی پر بچھا لیتے ہیں۔ عورتیں حیا کی وجہ سے نہ تو باہر سو سکتی ہیں۔ اور نہ نلکے پر نہا سکتی ہیں۔

چمڑے کی برآمد ہندوستان کی ایک بڑی تجارت ہے۔ لیکن چمڑہ کمانے کا کام صرف اچھوت لوگ کر سکتے ہیں۔ بمبئی کے باہر چمڑہ کمانے والے سب تامل لوگ ہیں۔ جو احاطہ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ وہاں یہ زمینداروں کے مزدور تھے۔ جہاں انہیں سات روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اور بمبئی میں کیم فروری تک وہ ۸ روپے ماہوار کماتے تھے۔ لیکن ایک کامیاب ہڑتال کے بعد اُن کی تنخواہ ۱۵ روپے ہوگئی تھی۔ یہ لوگ اِس صنعت کے واحد مالک ہیں۔ کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی ذات کا ہندو بھی کچے چمڑے کو ہاتھ نہیں لگائیگا۔ یہ سیاہ فام تامل لوگ ۱۲ گھنٹے روز کام کرتے ہیں۔ چونے اور ٹمناک ایسڈ کی وجہ سے اُن کی جلد جل جاتی ہے۔ اُن کے ہاتھوں کی کھال ایسی ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ جوتے کے تلے۔ یہ سال میں ۳۶۵ دن برابر کام کرتے ہیں۔ جو جھونپڑیاں انہوں نے اپنے ہاتھ بنائی ہیں۔ تمام سال وہ اُنہیں کے اندر کھانا پکاتے اور سوتے ہیں۔ ایک جھونپڑی کے اندر جو ۱۸ فٹ طویل اور ۳۲ فٹ عریض تھی۔ ۳۰ آدمی رہتے تھے۔ میں نے ایک اور جھونپڑی دیکھی۔ جو ۱۲ فٹ مربع تھی۔ مگر ۴ فٹ سے زیادہ اونچی نہ تھی۔ اِس گپھا کے اندر ۲ آدمی رہتے تھے۔

ہندوستان میں ورک شاپوں کی بڑی تعداد قانونی نگرانی سے محروم ہے۔ یا تو اِس وجہ سے کہ وہ چھوٹے چھوٹے کارخانے ہیں۔ اور یا اس وجہ سے کہ وہ کلوں سے کام نہیں لیتے۔ اور فیکٹری ایکٹ اُن پر عاید نہیں

ہوتا۔ حالانکہ کل ملک کے ایک کروڑ ۸ لاکھ صنعتی مزدوروں میں سے ایک کروڑ سے زیادہ ان چھوٹے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اِن میں سے بعض امرتسر کے قالین بافی کے کارخانوں کے مانند مستقل ہیں۔ یہ قالین یا تو والیان ریاست خریدتے ہیں۔ یا امریکہ کے دولتمند لوگ ان میں آٹھ آٹھ سال کے لڑکے کھڈیوں میں بیٹھے ۱۰ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ اور انہیں دو ڈھائی آنے روزانہ مزدوری ملتی ہے۔ یہ لڑکے عملی طور پر غلام ہیں۔ کیونکہ کارخانے والے انہیں اُن کے والدین سے یکمشت رقم پر خرید لیتے ہیں۔ بعض موسمی کارخانوں یعنی جنگ فیکٹریوں میں بعض دفعہ ۱۸ گھنٹے مسلسل کام کیا جاتا ہے۔

اچھے اچھے کارخانوں میں بھی عام دستور یہ ہے۔ کہ مزدور کو تنخواہیں ماہوار دی جاتی ہیں۔ اور اکثر حالات میں مہینہ ختم ہونے کے بھی دو ہفتہ بعد۔ مزدور اپنے گاؤں سے پہلے ہی مقروض آتے ہیں۔ اس لئے ۶ ہفتے زندہ رہنے کے لئے انہیں پھر قرض لینا پڑتا ہے۔ فورمین کو رشوت دیکر اُسے ملازمت حاصل ہوگی۔ جسکے معنے یہ ہیں۔ کہ وہ قرضے کے نیچے اور دب جاتے ہیں۔ سودخوار مہاجن مزدوروں کو تنخواہ ملنے کے دن کارخانہ کے دروازے پر آ بیٹھتا ہے۔ اور پٹھان سودخوار تو اپنا سود لاٹھی کے ذریعہ وصول کر لیتے ہیں۔ عورتیں اور مرد۔ مزدور۔ مہاجن اور فورمین کے ہمیشہ غلام بنے۔ رہتے ہیں۔



پانچواں باب

مجلسی تبدیلیاں

جب میں بمبئی میں پہنچا۔ تو پہلی ہی رات کو میں ایک برہمن کا مہمان ہُوا۔ اور میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ کہ زمین پر بیٹھ کر طرح طرح کے ہندوستانی کھانے کھائے۔ اور یہ سُن کر مجھے اور بھی تعجب ہُوا۔ کہ میرا میزبان برادری سے خارج ہے۔ پہلی بیوی کے مرجانے کے بعد اُس نے ایک عورت سے شادی کی۔ جو اُس کی ہم مکتب تھی۔ ہندو دھرم شاستر کے مطابق یہ شادی کئی وجوُہ سے ممنوُع تھی۔ اول اِس لئے کہ لیڈی دُولہا سے نیچی ذات کی تھی۔ یعنی کہ وہ جین گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور دُوسرے یہ کہ وہ بیوہ تھی۔ میرے میزبان کو مجلسی قانون کو توڑنے کی وجہ سے عملی طور پر کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ ابتدا میں برادری کی پنچایت نے اِس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور اگر وہ اپنی اِس شادی کی بابت برادری کو تحریری اطلاع نہ دیتا۔ تو شاید وہ اسے نظر انداز کردیتی۔ لیکن اُس کے خاندان کے دوسرے آدمی برادری میں شامل رہے۔ اور لطف یہ کہ وہ اُسی کے مکان میں رہتے تھے۔ اُس کے دوست کھُلے طور پر اُس کے پاس

آتے تھے۔ اور وہ قومی تحریک کا ہردلعزیز لیڈر تھا۔ اس کی اس حیثیت میں بھی کوئی خلل نہیں پڑا۔

ذاتوں کی تقسیم ریلوے ٹرینوں اور کارخانوں کی موجودگی میں زیادہ عرصہ قایم نہیں رہ سکتی۔ جس میں ہرایک ذات کے آدمی اور نیچ ذات کے لوگ سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ذات پات کی بندش بڑے شہروں میں بھی صرف اس قدر باقی ہے۔ کہ ہندو ہوٹلوں میں شاذونادر کھاتے ہیں۔ یا رہتے ہیں۔ اور اپنی برادری کے لوگوں کے مہمان بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور قوم پرستی کی وجہ سے ذات اور عقیدے اور نسل کی تمیز کسی دن بالکل اُڑ جائیگی۔ مہاتما گاندھی کی تحریک ذات پات کی تحریک کو کامیابی کیساتھ توڑ رہی ہے۔ اگرچہ مہاتما جی کا یقین ہے۔ کہ ذاتوں کی ابتدائی حدُود کو قایم رکھنا چاہیئے۔ کانگرس کے والنٹیروں میں جو کیمپوں میں مل کر رہتے ہیں۔ ہندو اور عیسائی بلکہ اچھوت اور سب ذاتوں کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سادہ خوراک مل کر کھاتے ہیں۔ پرانے رواج کی صرف ایک علامت باقی رہ گئی ہے کہ اُن کے کھانا پکانے والے برہمن ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ مہاتما گاندھی اچھوت سُدھار کے حامی ہیں۔ لیکن اس کام میں وہ تنہا منہمک نہیں ہیں۔ میں چند ایسے آدمیوں سے بھی ملا ہوں جو کانگرس کی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے۔ اور اکثر آدمیوں کا میں نے ذکر سُنا ہے۔ جو اچھوتوں کی حیثیت بڑھانے اور اُن کو تعلیم دینے کی دل وجان سے کوشش کر رہے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سب لوگ برہمن ہیں۔ غرضیکہ اصولی طور پر تو مساوات کی جنگ فتح ہو چکی

ہے۔ بلکہ ایک اعلیٰ ذات کی ہندو عورت نے اچھوتوں کے حقوق کے لئے بھوک ہڑتال کی۔ اچھوتوں کو مندروں میں جانے کی اجازت دی جارہی ہے۔ لیکن ابھی ایک دو نسلوں کے بعد ایسا ہوگا۔ کہ اچھوت ادھار کی تحریک دیہات میں کامیاب ہو۔

بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ خود اچھوت لوگوں کے دلوں پر اپنی ذلت کا احساس بدرجہ غائت نقش ہوچکا ہے۔ اور وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو بنظر تقدس دیکھتے ہیں۔ شمالی ہند میں بھی جو اچھوت برہمنوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوکر کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو خواہ کیسی ہی بے تکلفی سے ہو۔ بلکہ میں نے تو انہیں باہم قہقہے لگانے اور مذاق کرتے بھی دیکھا ہے لیکن اچھوت کو یہ جرأت نہیں ہے۔ کہ پنڈت کے قریب تر آکر کھڑا ہو جائے۔ ایک مرتبہ میں دیہاتیوں کے ایک گروہ سے بات چیت کر رہا تھا۔ جو زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ایک اچھوت اُن کے حلقے سے باہر دُور کھڑا رہا۔ وہ ڈرتا ڈرتا آیا تھا۔ اور جلدی سے چلا گیا

دُوسری مشکل یہ ہے۔ کہ اچھوت لوگ فی الحقیقت نہائت گندے جاہل اور حد درجے کے مفلس ہیں۔ اور ان کے بعض فعل اِس قسم کے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر کراہیت آتی ہے۔ پرانے رسم و رواج کے خلاف قدم بقدم جنگ کرتے ہوئے اور برہمنوں کے اعلیٰ ذات کے غرور کو مسمار کرتے ہوئے اچھوتوں کو تعلیم دینے اور ان کی حیثیت کا معیار بلند کرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ میں نے دیکھا۔ کہ دیہاتی مدرسوں میں اب اچھوتوں کو داخل کیا جاتا ہے۔

لیکن میں جنوبی علاقوں میں نہیں گیا۔ جہاں کی نسبت میں نے سنا ہے۔ کہ وہاں بہت کم تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

یہ فرض کر لینا غلطی ہے۔ کہ پرانے خیال کے ہندوستانیوں میں عورتوں کو نیچا درجہ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کا طرزِ عمل عورتوں کے بالکل مختلف ہے۔ وہ اُن کے ساتھ عزت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ اور اگرچہ شادیاں بغیر دیکھے کی جاتی ہیں۔ لیکن عموماً شوہر اور بیوی کے مابین بڑی محبت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے پریم اور محبت کے گیتوں میں بہت کچھ نازک خیالی اور جذبۂ محبت پایا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ عورتوں کو تعلیم دینے کا رواج نہ تھا (جیسا کہ پہلے ایک حد تک یورپ میں بھی رواج تھا)۔

بال ودھواؤں کی زندگی نہایت بے کسی میں گذرتی ہے۔ کم سنی کی شادی کا ابھی تک رواج ہے۔ اگرچہ اُس میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اور جہالت اور ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے پر حفظانِ صحت کے ہر ایک قانون کو توڑا جاتا ہے۔ لیکن دو نسلوں سے ان تمام خرابیوں کی اصلاح ہو رہی ہے۔ اور ان عجیب و غریب سال میں ترقی کی رفتار نہایت تیز ہو رہی ہے۔

پردے کے خلاف جہاد

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز یہ امر ہے۔ کہ شمالی ہند کے پسماندہ علاقوں میں پردہ دفعتاً ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ لغو طریقہ کہ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر محفوظ رکھا جائے۔ مسلمان حملہ آوروں کے زمانے میں ہندو عورتوں کے لئے اختیار کیا گیا۔ اِس سے اِن کے دماغ غیر مکمل

رہ جاتے ہیں۔ اور اُن کی صحت تباہ ہو جاتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں دُھوپ اِس کثرت سے ہو۔ عورتیں تنگ گلیوں کے اندر سایہ دار مکانوں میں محبوس رہنے کی وجہ سے پلیگ اور تپِ دق کا شکار بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ پنجاب میں جہاں مرد بلند قامت اور مضبوط ہیں۔ عورتیں نازک پائی جاتی ہیں۔ لیکن شمال میں بھی اس سال بے شمار پردہ دار مکانوں کے دروازے کھل گئے۔ اور برقعے اُٹھا دیے گئے۔ کانگرس کی تحریک نے عورتوں کو ہر قسم کی قومی خدمت کا موقعہ دیا۔ اور انہوں نے بڑے حوصلے اور عقیدت سے اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اُنہوں نے عظیم الشان جلسوں میں تقریریں کیں۔ اور بڑی حد تک پکٹنگ کا کام کیا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں جیل گئیں۔ انہوں نے اکثر مقامی کمیٹیوں کے ڈکٹیٹروں کی حیثیت سے کام کیا۔ بلکہ اس غیر معمولی سال سے پہلے ہی مسز نیدڈو جو ایک شاعرہ ہیں۔ کانگرس کی پریذیڈنٹ بن چکی ہیں۔ بمبئی میں ہندو عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ لیکن شمال میں پردے کا اُٹھنا تعجب خیز تھا۔ میرٹھ میں جو چنداں ترقی کردہ شہر نہیں ہے۔ عورتوں کا جلسہ ہُوا۔ غور کرنے کے لئے کہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج کس طرح بلند کیا جائے آخر اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ جلوس نکالا جائے۔ حالانکہ یہ وہ عورتیں تھیں۔ جو تمام عمر پردے میں رہی تھیں۔ لیکن بغیر کسی جھجک کے وہ باہر نکل آئیں۔ اور چار پانچ ہزار عورتوں کا جلوس بازاروں میں سے گزرا۔ پھر وہ پردے میں نہیں گئیں میں نے اُن کو ہر ایک پبلک سرگرمی میں سب سے آگے پایا۔ اور مرد اُن کی کارگذاری کی بڑی فیاضی سے داد دیتے تھے۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں۔ وہ اپنی نقلی پارلیمنٹ کے مباحثوں میں یکساں حصّہ لیتے ہیں۔ شادی ووداہ کے اشتہاروں میں بھی مساوات

سکے اِس نئے رشتہ کا اثر پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی اخبارات میں اِس قسم کے اِشتہارات اکثر شائع ہوئے ہیں۔ اِن اشتہاروں میں یہ بھی درج ہوتا ہے۔ کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔ نوجوانوں کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ بیویاں اُن کے برابر تعلیم یافتہ ہوں۔ اور شادی کے اشتہاروں میں بعض دفعہ یہ بھی درج ہوتا ہے۔ کہ ذات پات کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں جن کی تعداد اقلیت میں ہے۔ اِس تبدیلی کو دیکھ کر یہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہیئے۔ کہ غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی اسی رفتار سے ترقی کر رہے ہیں۔ وہ بہت پیچھے ہیں۔ مجھے شک ہے۔ کہ ساردا ایکٹ کا دیہات کے رسم ورواج پر کچھ اثر پڑا ہے۔ میں نے ایک گاؤں میں اِس مسئلہ کا ذکر چھیڑا۔ ایک ہندو پروہت نے بیان کیا۔ کہ میں اِس ایکٹ کے حق میں ہوں۔ اور اُس نے کہا۔ کہ جب ہندوستان آزاد ہوگا۔ تو وہ اس سے بھی سخت قانون پاس کریگا۔ لیکن اُس نے کہا۔ کہ جن دیہات میں میں پروہتائی کرتا ہوں۔ قانون کا بہت کم اثر پڑا ہے۔ چار شادیوں میں سے تین میں قانون کی خلاف ورزی کیجاتی ہے۔ کیونکہ دادا۔ دادی کو یہ فکر ہوتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے پوتوں کی شادیاں کریں۔ میرے خیال میں اگر پروہتوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ تو صغر سنی کی شادیاں بند ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہندو شاستر کے مُطابق جب کسی لڑکی کی رجسولا ہونے کے بعد شادی نہ ہو۔ تو وہ اور اُس کے والدین نرک میں جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہندو سوسائیٹی کا کم سنی کی شادی بند کرنے پر آمادہ ہوجانا خصوصیت سے قابلِ غور ہے۔ ساردا ایکٹ کا مسودہ ناقص ہے۔ اِس میں سزائیں تو کافی رکھی گئی ہیں۔ لیکن عدالتوں کو سزائیں دینے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ نہ کوئی ایسی دفعہ ہے۔ جس کی رُو سے شادی سے پہلے اطلاع دینی ضروری ہو۔ تاکہ

انسدادی کارروائی ہو سکے۔ جب تک شادیاں درج رجسٹر نہ ہوں۔ صغر سنی کی شادی کا انسداد مشکل ہے۔ اور ہندوستان میں ابھی تک یہ دستور رائج نہیں ہے۔ اسمبلی کے ہندو ممبروں کو اس قانون کے نقائص کے متعلق مبہم نہیں کیا جا سکتا۔ گورنمنٹ کو مناسب تھا۔ کہ شادیوں کے درج رجسٹر کرنے کا طریقہ جاری کرتی۔ لیکن گورنمنٹ نے سردمہری کے ساتھ بے اعتنائی اختیار کی۔ کوئی ہمسایہ یا کوئی سوسائٹی شکایت کرے۔ اور اس کے ساتھ ضمانت کے طور پر نقد روپیہ داخل کرے۔ تب کہیں قانون حرکت میں آ سکتا ہے۔ ایسا غیر ہردلعزیز فرض کون شخص ادا کرے؟ اور اگر چند شخص کر سکتے تھے۔ تو وہ عدم تعاون تھے۔ اور جو جیل خانوں میں بند تھے۔ گورنمنٹ نے بھی نہایت کمزوری دکھلائی۔ جب پنجاب میں پہلا آزمائشی مقدمہ ایک مسلمان رئیس کے خلاف چلایا گیا۔ جس نے عمداً اور کھلم کھلا قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔ جونہی کہ اُسے سزا دی گئی۔ فوراً ہی معافی دیدی گئی۔ اُس کے بعد یہ قانون عملی طور پر مُردہ ہو گیا۔

گورنمنٹ نے کچھ عرصہ تک اِس معتدل قانون سے بھی گریز کرنا چاہا اور ایک ترمیمی بل تیار کیا گیا۔ جس میں درج تھا۔ کہ جن لوگوں کا ضمیر قانون کے خلاف ہو۔ وہ اُس سے بری کئے جائیں۔ اور شادی کی عمر لڑکیوں کے لئے ۱۲ برس کر دی۔ یہ بل گشت کرایا گیا۔ لیکن اُس پر مزید کارروائی نہیں ہوئی۔ تعجب یہ ہے۔ کہ اِس قانون کی منظم مخالفت ہندوؤں نے نہیں بلکہ مسلمانوں نے کی۔ نیشنل کانگرس نے نہیں۔ بلکہ مسلمانوں نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ساردا ایکٹ مخالفت پر کمربستہ کیا۔ مسلمان اِس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ شریعت کے معاملات میں حکومت کیوں دخل دے۔ اِس بات کا اندیشہ ہے

کہ ہندوستان کے نئے دستور اساسی پر، مذہبی جماعتوں کے حقوق اب ایسے محفوظ ہوں گے۔ کہ اہم مجلسی معاملات کے متعلق حکومت کوئی قانون نہ بنا سکے گی۔

بہرحال حکام کی اس کمزوری کے باوجود ہندوستان حفظانِ صحت اور تعلیم کے معاملے میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ کلکتہ میونسپلٹی نے جس کی عنانِ انتظام مسٹر سی۔ آر۔ داس مرحوم اور مسٹر سین گپتا اور مسٹر سبھاش چندر بوس جیسے لیڈروں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ کمال کر دکھایا ہے۔ اگر ہندوستان اپنے آپ پر ایسی تعمیری سپرٹ کے ساتھ حکومت کرے۔ جو کلکتے نے ظاہر کی ہے تو اُس کا مستقبل نہایت روشن ہے۔

یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہ آبادی کے اضافے کے مسئلے کو حل کرنے کی بھی جرأت کریگا۔ ریاست میسور نے برتھ کنٹرول کے چار کلینک قایم کئے ہیں۔ اور احمد آباد میں کارخانوں سے بیدار مغز مالک انبالال سارابھائی نے اپنی ملز کے اندر ایک کلینک قایم کیا ہے۔ بعض راسخ الاعتقاد مسلمان لیڈروں سے میری بات چیت ہوئی۔ اِس معاملے میں اُن کو بھی کوئی تعصب نہ تھا۔

ان مجلسی تبدیلیوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ ہندوستانی جو کوئی کھیل نہیں کھیلتے تھے۔ اور جسمانی ترقی کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ اب کھیل کود کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔ اُن کے درمیان کرکٹ ہر دلعزیز ہوتا جاتا ہے۔ کلکتے میں برہمو سماج کے ایک مدرسے میں میں نے لڑکیوں کو نہایت عمدہ گتکا کھیلتے دیکھا۔ یہ ایسا کھیل ہے۔ جس میں نظر کی تیزی اور نقل و حرکت کی پھرتی کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ بات صفائی کے ساتھ کہہ دینی ضروری ہے۔ کہ جمناسٹک

اور تو اعد وغیرہ میں نوجوان حصہ بے قدر دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہ ایک قسم کی فوجی تیاری ہے۔ متمول نوجوانوں میں ہوائی جہاز رانی کی ہردلعزیزی کا کارن بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نوجوان ہندوستان جنگ کے لئے تیار ہو رہا ہے آئندہ ۲۰ سال کے اندر اگر ذمہ دار گورنمنٹ نے اِن میلانات کی حوصلہ افزائی کی۔ تو ہندوستانیوں کی جنگجو اور غیر جنگجو جماعتوں کی تفریق داستان پارینہ بن جائے گی۔

چھٹا باب

لیڈروں کی شخصیت کے اثرات

شخصیت کی طاقتیں جو ہندوستان کی تقدیر کو ڈھال رہی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی طاقت مہاتما گاندھی کی ہے۔ جو یرودا جیل کی چاردیواری کے اندر محبوس ہیں۔ اُنہوں نے مردوں اور عورتوں کے خیالات پر اثر ڈالا ہے۔ میں مہاتما گاندھی کی کئی ایک ساتھیوں سے ملا ہوں۔ جن کے دلوں پر اُن کا اثر پڑا ہے۔ اور گاندھی آشرم میں بھی میں نے چند گھنٹے صرف کئے ہیں۔ یہ جگہ کوئی خانقاہ نہیں ہے۔ اگرچہ گاندھی جی کے چیلے وہاں رہتے ہیں۔ اور وہاں کئی قسم کے ضابطوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک خاندان کے آدمی مِل کر ایک جگہ رہتے ہیں۔ اور روحانی گرُو کے گرد جمع ہو گئے ہیں

آشرم میں ہر شخص مہاتما جی کو باپو کے نام سے پکارتا ہے۔ وہاں عورتیں اور بچے بھی رہتے ہیں۔ اور بعض زن و شوہر بھی ہیں۔ لیکن اُن میں برہمچریہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ وہاں باغیچے بھی ہیں اور مویشی بھی۔ اور ہر شخص کیلئے چرخہ کاتنا لازمی ہے۔ اس کو ایک چھوٹا سا گاؤں سمجھنا چاہیئے۔ جو مِل کر عبادت کرتے ہیں۔ اور مِلکر کام کرتے ہیں۔ اور مِلکر کھیلتے ہیں قبل از طلوعِ آفتاب سے لے کر شام ہونے تک کی اوقات کے لئے چند ضوابط مُعیّن ہیں۔ جو ایسے سادہ اور آسان ہیں۔ کہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں۔ یہاں لوگ ہدایت اور روشنی لینے کے لئے آتے ہیں۔ تاکہ وہ واپس جا کر ملک کا کام اچھی طرح کر سکیں میرا خیال ہے۔ کہ اعلیٰ تعلیم اور شائستگی رکھنے والے لوگوں نے ایسی سادہ زندگی کبھی اختیار نہ کی ہوگی۔ جیسی کہ اس آشرم کے آدمیوں کی ہے۔ یہاں ایک خاندان کے لئے آدمیوں کی سی زندگی ہے۔ جو مِل جُل کر رہتے ہیں۔ مرد عورتوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ برت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ جسمانی ترقی سے نفرت نہیں کرتے یورپ کے تارکُ الدنیا لوگوں نے جبکہ وہ ہر قسم کی خواہشات کو ترک کر دیتے تھے۔ لذتِ حواس کو اس درجہ تک ترک نہیں کیا تھا۔ عیسائی خانقاہوں میں عمارت کی خوبصورتی اور تصویروں سے نفرت نہیں کیجاتی۔ لیکن ہندوستانی جب ایشور کی طرف دھیان لگاتے ہیں۔ تو وہ سب چیزوں سے اپنی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اس آشرم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو آنکھوں کے لئے دلفریب ہو۔ البتہ یہاں کے درخت خوبصورت ہیں۔ آشرم واسیوں کے رہنے کی جگہ صحن کوٹھڑیاں سی ہیں۔ جہاں بانس کی چارپائیاں بچھی ہیں یا پانی پینے اور نہانے کے لئے ایک دو برتن ہیں۔ البتہ مہاتما جی کی کوٹھڑی میں چند کتابیں ہیں۔ لیکن وہ کسی خیال سے جمع نہیں کی گئی ہیں۔ اِس

تیاگ ۲ ی عزت کریگا۔ کیونکہ اس سے فطرت انسانی کے جذبات پر قابو پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ سب کچھ قابل تعریف ہے۔ یا نہیں۔ ممکن ہے۔ کہ یہ رُوحانی طاقت کے لئے اصلاح کا ذریعہ ہو۔ جس کی ہم یورپین لوگوں کو ضرورت ہے۔ ہم اس قدر ضروریات فراہم کر لیتے ہیں۔ کہ وحدت کا خیال گم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کا خدا تک پہنچنے کا راستہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو کم کرتا جاتا ہے۔ اور وہ ترک کی وجہ سے وحدت تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔

ایک بڑے برآمدے میں ہم کھانا کھانے بیٹھے۔ جو اگرچہ سادہ تھا۔ مگر کافی مقدار میں تھا۔ ہندوستانی لوگ کھاتے وقت بات چیت نہیں کرتے آشرم کے جوان آدمیوں نے کھانا پروسا۔ ایک یورپین اس کھانے کو دلچسپی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس نظارے سے ایک ہندو کے دل پر کیا گذرتی۔ کیونکہ دوسرے آدمیوں کیساتھ ایک اچھوت لڑکی بھی کھانا اور پانی تقسیم کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو تو پانی کے ہر ایک گھونٹ کے ساتھ نرک کنڈ نظر آئے گا۔ اعلیٰ ذاتوں کے آدمیوں اور اچھوتوں کا اس طرح سے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا ہندوستان کے اتحاد کی علامت ہے۔ اور آشرم میں کھانا بلا تکلف سادہ طور پر کی گئی۔

ہم یورپین لوگوں کو اگر کبھی ذات پات توڑنے کا موقع ملتا۔ تو شاید بڑے شور و غل اور دھوم دھام کے ساتھ ایسا کرتے۔ اخوت انسانی کے گیت بناتے۔ اور اچھوت کا پانی پینے سے پہلے اُسے گاتے لیکن ہندوستانی نہایت حلیم الطبع ہیں۔ انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جس سے اچھوت کو اپنی پہلی ذلت یاد آ جائے۔ یہ کافی تھا۔ کہ کھانے کے لئے

سب ایک قطار میں بیٹھیں۔ مذہب کے متعلق یہ طرز عمل ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا ہے۔ مہاتما گاندھی ویشن ورن رکھتے ہیں۔ اور راسخ الاعتقاد برہمنوں کی طرح دھرم شاستر کو مانتے ہیں۔ وہ تقسیم کی حمایت کرینگے۔ اگرچہ اُن کے توڑنے میں جو کچھ انہوں نے کیا۔ وہ اور کسی ہندوستانی نے نہیں کیا ہندو دھرم کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ چند رواجوں اور قوانین اور رسمیات کا مجموعہ ہے۔ مہاتما جی ذاتوں کو قایم رکھتے ہیں۔ لیکن وہ قومی خاندان میں اچھوتوں کو داخل کرتے ہیں۔ اہنسا پر اُن کا بڑا زبردست اعتقاد ہے۔ جس کی رُو سے ہر ایک جاندار کی رکھشا کرنا ضروری ہے۔ لیکن جب آشرم میں ایک بچھڑا ایک ناقابل علاج مرض میں مُبتلا ہوا۔ تو ازراہِ ترحم انہوں نے اُسے زہر کی پچکاری دیکر ہلاک کرا دیا۔

جب شام ہوئی۔ تو آشرم کے لوگ دریا کے کنارے پرارتھنا کے لئے جمع ہوئے۔ مرد عورتیں اور بچے بڑی خوشی خوشی آئے۔ رات دن میں یہ اُن کیلئے سب سے زیادہ شادمانی کا وقت تھا۔ شاید رومن کیتھولک لوگوں کو عبادت کرتے وقت اتنی خوشی حاصل ہوتی ہوگی۔ میرے خیال میں پروٹسٹنٹ لوگوں کو یہ خوشی شاذ و نادر ملتی ہے۔ جس وقت باجہ بجنا شروع ہوا۔ تو خاموشی چھا گئی۔ کاش کہ میں بھگوت گیتا کے طویل شلوکوں کو سمجھ سکتا۔ لیکن گانے والوں کے آنکھوں اور بشرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ نہایت آنند محسوس کر رہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو اس خاندان کے حلقے سے باہر خیال نہیں کرتا تھا۔ اور اگرچہ اُن میں ایک بدبشٹی تھا۔ لیکن وہ بھی شانتی اور پریم کے جذبے سے معمور تھا۔

میں نہیں جانتا۔ کہ میرے دل پر کیوں اثر ہوا۔ ممکن ہے۔ کہ ہندوستانیوں کی نسلی حلیمی نے مجھ پر اثر ڈالا ہو۔ لیکن میں عام طور پر اِس حلیمی کو ناپسند کرتا ہوں۔ بلکہ اُس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کیونکہ اِس حلیمی کی وجہ سے یکے بعد دیگرے وہ بہت سے حملہ آوروں اور غاصبین کے ظلم کا شکار ہوتے گئے۔ اِس کی وجہ سے وہ ہر روز سُود خواروں زمینداروں فورمینوں اور پولیس کے ظلم اٹھاتے ہیں۔ جن کی کوئی بربریت مغربی قوم ملکوں سے خبر لیتی۔ بلکہ لاٹھیوں اور پتھروں اور خنجروں سے۔ اجڈ مزاج کے انگریز ہندوستانیوں کی کبھی بے عزتی نہ کرسکتے اور مار سکتے جیسا کہ وہ اکثر کرتے ہیں اور زمانے سابق میں اکثر کرتے رہے ہیں۔ اگر اِس بات کا خیال ہوتا۔ کہ ایک ہندو بینٹ کا جواب پتھر سے دیگا۔ وہ سکھوں اور پٹھانوں کے ساتھ ہرگز اِس طرح پیش نہیں آتے۔ تو کیا یہ حلیمی اور مجہولیت (اگر تمہارا دل چاہے تو اِس کو بزدلی کہہ لو) کہیں گرمی کی شدت اور ملیریا اور نیم فاقہ مستی کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ یہ سب باتیں اپنا اپنا اثر ضرور دکھلاتی ہیں۔ لیکن اہنسا کے نہایت بخشی اصول نے حلیمی کو اور بھی تقویت دی ہے۔ اُس نے مجہولیت کو وقعت دی ہے۔ بے اعتنائی کو آدرش بنایا ہے۔ اور نکمّا پن اور بے پروائی کو معیار بنا لیا ہے۔ اور ایک شریفانہ بہانہ بنا لیا ہے۔ اِس وجہ سے کہ لوگوں کی جسمانی طاقت ناقص ہے۔

شاید ناظرین اعتراض کرینگے۔ اور کہینگے کہ عدم تشدد نے وہ شے حاصل کر لی ہے۔ جس کی مہاتما جی کو اُمید تھی۔ اِس کی وجہ سے یورپ جھک گیا ہے۔ لیکن کیا اِس تحریک کے اخلاقی پہلو نے ہم پر اثر ڈالا ہے میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو اِس تحریک کو دبانا تھا۔ اُن کے حوصلے بڑھ

گئے ہیں۔ انہیں ان مزاحمت نہ کرنے والے لوگوں کو پیٹنے میں کچھ ندامت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ آئم گھات نہایت ہی اندوہناک ہے۔ زمین پر لیٹ جانا۔ تاکہ انہیں پاؤں کے نیچے کچلا جائے۔ حصولِ مقصد کا ایک ایسا ہی کم قوی طریقہ ہے۔ جیسا کہ تشدد۔

اگر اخبارات انگلینڈ اپنے ناظرین کو اس خاموش اپیل کی شدت محسوس کراتے۔ تو دُور دراز انگلستان میں بیٹھے ہوئے۔ ہم لوگوں کو ضرور ندامت محسوس ہوتی۔ مگر خبریں سینسر کی جاتی تھیں۔ جس طرح کہ اب سینسر کی جاتی رہی ہیں لیکن ہمارے اخبارات کو چنداں سنسر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی مدد کرنا پسند نہ کیا۔ اور یہاں کے واقعات کی کوئی تصویر شایع نہ کی۔ جس سے باشندگان انگلینڈ میں میرے پاس مہاتما گاندھی کے اخبار ینگ انڈیا کی ایک کاپی کس طرح پہنچ گئی۔ ایک ورق پر یہ تجربہ پر ایک مضمون لکھا ہوا تھا۔ دوسری طرف کانگرسیوں کی گرفتاری کی خبریں تھیں کہ بیس آدمی گرفتار ہو گئے۔ سو وہاں پکڑے گئے۔ میں نے اس کا اقتباس لنڈن کے ایک ہفتہ وار اخبار میں دیا۔ لیکن گھوڑدوڑوں کی خبروں۔ قتل کے مقدموں کی رپورٹوں۔ اور سیج معاملات میں کشتیوں کی دوڑ کی خبروں کے سامنے اس کو کون پڑھتا۔

جن لوگوں کے مذاق اس قسم کے ہیں۔ ہم ان کے مزاج دان بن گئے ہیں جن باتوں کا انگریزوں پر اثر ہوتا ہے۔ وہ بالکل مختلف ہیں۔ ہم اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ جس وقت ہندوستان سے محاصل کی آمدنی کم ہوئی۔ اور ہماری تجارت برباد ہو گئی۔ اور ہندوستان کا بجٹ پورا کرنے کے لئے لندن سے قرض لینا پڑا۔ اس وقت ہمیں یہ احساس ہوا تھا۔ کہ ایک قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کا انتظام نہیں چل سکتا۔ اہنسا کی عظمت نے ہم پر کوئی اثر نہیں ڈالا

دیشر طیکہ اُسے شاندار کہہ سکیں) اہنسا سے ہمارے دل نرم نہیں ہوئے بلکہ ایک منظم سول نافرمانی کے کارگر ہونے سے ہم متاثر ہوئے۔ تشدد سے محترز رہنا بلاشبہ نہایت دانائی کا فعل تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس ٹینک اور ہوائی جہاز اور زہریلی گیسیں ہیں۔ لیکن اِس تحریک کو ایک اخلاقی جنگ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ مسلح بغاوت اخلاقی دلیل نہیں ہوسکتی۔ یہ اقتصادی جنگ تھی

اِس تحریک کی اخلاقی عظمت زیادہ تر اِس امر میں مضمر تھی۔ کہ اُس نے کانگریسیوں میں تیاگ اور بھگتی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اور اُنہوں نے ہندوستان کے عوام الناس کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ میں نہیں جانتا۔ کہ انسانی ہمدردی کے اِس جوش کا اِس خیال سے کہ لوگوں سے کیا تعلق ہے۔ جو لذات حواس کا ترک کرنا اچھا خیال کرتے ہیں۔ اگر جسم ایسی ہی غیر اہم چیز ہے۔ تو مزدوروں کی صحت اور اُن کے لئے اچھے مکانات مہیا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاندھی جی اپنا فلسفہ وضع کرنے میں خواہ کتنے ہی کامیاب ہوئے ہوں۔ لیکن انہوں نے ہندوستانی زندگی میں رحم اور ہمدردی کو ایک زبردست طاقت بنا دیا ہے۔ یہ محض ایک خیالی جذبہ نہیں ہے۔ بلکہ اُن کاموں میں جو تنظیم کے ساتھ عمل میں لائے گئے ہیں اُن پر عمل کر کے دکھایا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ میں یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ مہاتما جی کے چیلے گجرات کے دیہات کے کسانوں اور خانہ بدوش قبیلوں کو کیا فایدہ پہنچا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے آشرموں کے دروازوں پر پولیس اپنے زانوؤں پر بندوقیں رکھے بیٹھی ہے۔ البتہ احمد آباد میں کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں کی انجمن کے کام میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ یہ ایسوسی ایشن گاندھی جی نے قایم کی تھی۔ اور اُس کا انتظام

تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو لوگ احمد آباد دہلی میں اس یونین کو چلا رہے ہیں۔ وہ مہاتما جی کے چیلے ہیں۔ اور اُن میں مذہبی عقیدت کی سی سپرٹ موجود ہے۔ وہ مہاتما جی کے تمام خیالات کی پورے جوش کے ساتھ پیروی کرتے ہیں۔ چرخہ کاتتے ہیں۔ اور مسکرات کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ احمد آباد کے سب سے بڑے مالک کارخانجات کی بہن انسویا بائی۔ سارا بھائی اُن کے لیڈر ہے۔ جس نے اپنا تمام وقت اور تمام دولت یونین کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اچھوت بچوں کے لئے اُس نے اپنے باغ میں ایک مدرسہ جاری کر رکھا ہے۔ اس تعلیم سے اچھوتوں میں خودداری اور شادمانی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ میں نے اچھوت لڑکوں کو اس خوشنما جگہ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ناچتے دیکھا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال آجاتا ہے۔ کہ دوسرے کئی کروڑ اچھوت ایسے ہیں۔ جن کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ یونین اپنے ممبروں کو تعلیم دیتی۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے وہ اپنے مختصر چندے سے باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔ جو ہندوستان میں ایک نادر بات ہے۔ اور وہ انہیں اپنے کام میں دلچسپی لینے کی تعلیم دیتی ہے لیکن اگر مالک کارخانہ کی مرضی نہ ہوتی۔ تو یونین ہرگز وجود میں نہ آتی۔ یونین کے دفاتر میں بڑی سرگرمی سے کام ہوتا ہے۔ ایک مجلسی مرکز ہے۔ جہاں مزدور لوگ فرصت کے وقت آتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے خلاف وہاں سرگرمی سے جنگ نہیں کی جاتی۔ مہاتما گاندھی طبقاتی جنگ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا مطمح نظر نیاشانہ ہے۔ وہ سوسائٹی کی موجودہ حالت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور وہ ایک سرمایہ داروں کی جماعت اور مزدوروں کی جماعت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ ذاتوں کی تقسیم کی حمایت کرتے ہیں۔ اور اُس کے

وہ مزدوروں کی حیثیت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ یہ یونین آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس سے علیحدہ ہے۔ جس میں انتہا پسندوں کی کثرت ہے۔ اس یونین نے ۱۹۲۳ء سے لیکر آج تک کوئی ہڑتال نہیں کی۔ اور اگر کوئی جزوی ہڑتال ہوتی ہے۔ تو وہ ایک ہی مل تک محدود رہتی ہے۔ اور یہ زیادہ تر مہاتما جی کے شخصی اثر کا نتیجہ ہے۔ جب کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ ثالث بن کر فیصلہ کرا دیتے ہیں۔ یونین کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے۔ کہ اس کے افسروں کے لیئے یہ حق حاصل کر لیا گیا ہے۔ کہ افراد کی شکایت کی تحقیقات کرنے کے لئے مل کے اندر جا سکیں۔ ایک سال میں ۴ ہزار شکایتوں کا انسداد کیا گیا۔ اس روزانہ نگرانی اور ثالثی کی وجہ سے مزدوروں پر چھوٹے چھوٹے ظلم نہیں ہوتے یا نئے ہندوستانی ملوں میں کارخانے کا منتظم اتنا ظلم نہیں کرتا۔ جتنا کہ مزدوروں کو بھرتی کرنیوالے اور فورمین کرتے ہیں۔ ہاں یہ یونین اپنے ممبروں کو تعلیم دیتی ہے۔ ان کے لیئے تفریح کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اور انہیں وزیر بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ۸ صفحہ کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتی ہے۔ جو ممبروں کو مفت ملتا ہے وہ شراب کی دوکانوں کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ اس نے ایک سینما قایم کر رکھا ہے۔ ایک ریڈنگ روم اور ایک گشتی لائبریری اور ورزش کے لیئے اکھاڑے۔ کبھی کبھی وہ ایک نمائش بھی کرتی ہے۔ جس میں تصویروں کے ذریعے حفظان صحت اور بچوں کی پرورش کے متعلق ان لوگوں کو بھی سبق دیا جاتا ہے۔ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اگرچہ یونین کے ذرایع محدود ہیں۔ لیکن وہ بڑے شوق اور جوش سے کام کرتی ہے۔ مجھے اس کے تمام انسٹی ٹیوشنوں میں سے اس کے نائیٹ سکول بہت پسند آئے۔ جو بڑی عمر کے ناخواندہ مزدوروں کے لیئے ہیں۔ استاد ایک نائیٹ سکول میں

اجرت تنخواہ کے کام کرتا تھا۔ موم بتی کی روشنی میں پڑھا رہا تھا۔ انقلاب سے پہلے روس میں بھی ایسے ہی مدرسے تھے۔ بچوں کے۔ لئے ۲۳ مدرسے ہیں جن میں ۱۵ سو لڑکے اور ۸۰ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ایک ہسپتال بھی ہے جس میں ۳۰ بستر ہیں۔ اور دوا خانے۔ ان کے رسٹوراں بھی ہیں۔ اور غلے کی دکانیں۔ ایک سیونگ بنک اور ایک قرضے کا دفتر۔ جہاں سے یونین کے ممبر کم سود پر قرضہ لے سکتے ہیں۔ میونسپل انتخابات میں بھی یونین نے اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ اور مقامی کمیٹی کو مزدوروں کے لئے اچھے مکانات بنانے پر مائل کر لیا ہے۔

مزدوروں کے لیڈروں میں اکثر بے غرض کام کرنے والے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں۔ جو اس لیڈری کو اپنی سیاسی حیثیت بڑھانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بعض یونینوں کا وجود جو ایک لیڈر کو کسی کونسل کا ممبر بنانے کا سبب ہوئی ہیں۔ صرف کاغذ پر ہے۔ اور بعض کو رقیب کارخانوں سے مالی امداد ملتی ہے۔ تاکہ وہ ہڑتال کر کے اپنے کارخانے کو نقصان پہنچائیں بمبئی میں ایک بڑی تند و تیز ٹریڈ یونین ہے۔ جس کے ممبر اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے اور یقینی طور پر بالشویک اصولوں کے ماننے والے ہیں۔ اس کا نام گرانی کامگار یونین ہے۔ جب اس کا عروج تھا۔ تو اس کے ۵۰ ہزار سے زیادہ ممبر تھے۔ لیکن اُن کی تعداد ۵ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اس علاقے میں اس نے ہر ایک کارخانے میں منتخب شدہ مزدوروں کی کونسل بنا رکھی تھی۔ بمبئی کی تباہی بخش ہڑتال میں یہ یونین کمزور ہو گئی۔ اس وقت سے اس کے اندر نفاق پیدا ہو گیا۔ اور کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ خیالات کے مزدور علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ اس یونین میں بڑی زندگی تھی۔ لیکن اس نے

مزدوروں کی قوتِ برداشت میں تکان پیدا کی۔ اُس کو یہ فخر حاصل تھا۔ کہ بیرونی امداد کے بغیر وہ اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی

آج کل کی سیاسی خبروں کے زمرے میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ ایک نسل پہلے قوم کی تقدیر بڑھانے والی طاقتوں میں اِس سوسائٹی کا درجہ بہت بلند تھا۔ بہت سال گزرے۔ کہ سوسائٹی کے بانی مسٹر گوکھلے آنجہانی سے لنڈن میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بڑے فراخدل تھے۔ خود نمائش سے بیزار خاموش کام کرنے والے تھے۔ میں انہیں اپنے زمانے کے بڑے آدمیوں میں شمار کرتا ہوں۔ اُنہوں نے یہ سوسائٹی قایم کی تھی۔ جو اب تک کام کر رہی ہے۔ اور اُس نے اپنے بانی کی معقولیت کی سپرٹ اور اُس کے صبر و تحمل اور انتظامی قابلیت اور محنت کے کام کو جاری رکھا ہے۔ مسٹر گوکھلے باغی نہیں تھے۔ وہ امپیریل کونسل کے ممبر تھے۔ اور گورنمنٹ کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اُنہوں نے کچھ عرصہ کانگرس کی رہنمائی کی۔ اور اُس زمانے کے انتہا پسند لیڈر مسٹر تلک کے ساتھ عرصہ دراز تک اندرونی کش مکش میں لگے رہے۔ مسٹر تلک بڑی زبردست شخصیت رکھتے تھے۔ وہ بڑے بھاری قوم پرست تھے۔ لیکن سوشل خیالات میں وہ قدامت پسند برہمن تھے۔ سرونٹس سوسائٹی کے ممبر اپنی تمام عمر مادرِ وطن کی خدمت کے لئے وقف کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کماتے ہیں۔ وہ سوسائٹی کی مشترکہ جایداد سمجھی جاتی ہے۔ اِس سوسائٹی میں داخل

ہونا آسان نہیں ہے۔ جس میں صرف ۱۰ آدمی شامل ہیں۔ جن میں سے آج کل مسٹر شاستری اور مسٹر جوشی زیادہ مشہور ہیں۔ ہر ایک ممبر اپنی اپنی پسند کے موافق خاص میدان میں کام کرتا ہے۔ بعض سیاسی کام کرتے ہیں۔ بعض مزدوروں کے منظم کرنے کا۔ بعض خانہ بدوش قبیلوں کی اصلاح کا۔ بعض عورتوں کی حیثیت کو ترقی دینے کا۔ اس سوسائٹی میں اگرچہ خانقاہ کی سی عقیدت کی سپرٹ پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ مذہبی سوسائٹی نہیں ہے۔ سوسائٹی کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہے جس میں اقتصادیات اور سیاسیات کی کتابیں ہیں۔ سوسائٹی تمام باتوں سے بڑھ کر دماغی ترقی کا خیال رکھتی ہے۔ اور سائنٹفک سچائیوں کی قدر کرتی ہے۔ مہاتما گاندھی بھی سچائی کو بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اپنے چلن اور دماغی برتری کی وجہ سے ہندوستان میں اس سوسائٹی کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں اعتدال کیساتھ ہمت اور مستعدی پائی جاتی ہے۔ گورنمنٹ اسکو تنگ نہیں کرسکتی۔ اور نہ سوسائٹی عوام الناس کے جذبات سے کچھ مطلب رکھتی ہے۔ اس میں سب کچھ وان کرنے کی قومی خدمت ہے۔ یہ فلسفہ کا ایک بچہ ہے۔ جس نے مغربی سائنس اور جوگیوں اور سنتوں کے خیالات پر تربیت پائی ہے۔ مشرق اور مغرب کی یہ روحانی شادی ہندوستان میں شانتی پیدا نہیں کرسکتی۔ کیونکہ ہم اپنے سائنس کے ساتھ رنگت کا تعصب بھی لائے ہیں۔ جس وقت میں علم اور عقل سے لوگوں کے دماغ منور ہونے لگے۔ تو ہم نے نسلی محکومی کا زہریلا احساس ان کی شریانوں میں داخل کردیا۔ چونکہ یہ سوسائٹی سیاسی لبرل خیالات کا پرچار کرتی ہے۔ اس لئے اس کی نوعیت خالص ہندوستانی نہیں ہے۔ اور اس کے ذریعے عوام میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوسکتی۔

وہ رفتہ رفتہ ترقی کرنے والی اور آئین پسند ہے۔ اُس کے طریقوں میں کوئی
ایسی بات نہیں۔ جس سے لوگوں کے جذبات پر اثر پڑے۔ اِس سرزمین
میں یہاں دیوتاؤں کی بہتات ہے۔ وہ بالکل غیر مذہبی سوسائٹی ہے۔ اِس
سوسائٹی کے ممبروں میں اگرچہ زیادہ تر برہمن ہیں۔ لیکن وہ مذہبی پجاریوں کے
خلاف ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اپنے مذہب کے مذہبی اصول کو اپنی قوم کے نہایت
قدیم تہذیب سے وابستہ کیا ہے۔ اِس سے عوام بیدار ہو سکتے ہیں۔ وہ بدیشی
گورنمنٹ کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس نے ہندوستان کے جذبۂ
خودداری کو ضرب لگائی ہے۔ مہاتما جی اُسے شیطانی گورنمنٹ کہتے ہیں۔ اور
اس کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بغاوت خونریزی سے کوئی
تعلق نہیں رکھتی۔ لبرل لوگ جب کانگرس کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ان کے لہجے میں
کچھ تلخی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے عوام الناس اُن سے بہت آگے
نکل گئے ہیں۔ اور انہیں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ بمبئی کی کانگرس کے دفتر میں
جب وہ کھلا ہؤا تھا۔ عجیب وغریب مظاہرے ہوتے تھے۔ اِس سے باہر
بڑے بڑے ہجوم بازاروں میں کھڑے رہتے تھے۔ اِس کے احاطہ میں بیشمار
موٹر کاریں اُن کی خدمت کے لئے موجود رہتی تھیں۔ اور صدہا نوجوان اُن کے
دفتروں میں بڑے جوش وخروش سے کام کرتے تھے۔ لیکن وہاں سے ۱۰ منٹ
کی راہ پر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اور ایک سفید پوش
ممبر خاموشی کے ساتھ بیٹھا لائبریری میں مطالعہ کر رہا تھا۔

اکثر قوموں کی نسبت ہندوستان کو اِس بات کی زیادہ ضرورت ہے۔
کہ اپنے مزاج کو شانت رکھے۔ اگر کسی وقت اِس بات پر توجہ ہوئی۔ تو ممکن ہے
سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی پھر عروج حاصل کرے۔ پونا میں سوسائٹی کی اقتصادیات کی لائبریری سے جن کا مونگی

ترغیب سوسائٹی کو ملتی ہے۔ وہ اُن کاموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جو مہاتما جی کے آشرم کے عقیدت مند کرتے ہیں۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر بمبئی میں ٹریڈ یونینوں کی تنظیم کرتے ہیں۔ وہ شخص سوسائٹی کا ایک عالم و فاضل ممبر تھا۔ جسے قدرت نے طالب علمی کے لئے پیدا کیا تھا۔ جو چمڑا کمانے والے اچھوتوں کے مابین گیا۔ اگرچہ وہ اُن کی تامل زبان نہیں بول سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اُن کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور ایک ٹریڈ یونین بنا لی۔ اور پھر اُن سے ایک نہایت کامیاب ہڑتال کرائی۔ پارچہ بافی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو پہلے مسٹر جوشی نے اور پھر مسٹر باکھلے نے منظم کیا۔ پونا کے گردونواح دیہات میں بھی تم ان کو کام کرتے پاؤ گے۔ بعض دیہات میں وہ اکثر جاتے رہتے ہیں۔ اور انہیں حفظانِ صحت کے اصول بتاتے رہتے ہیں۔ اور ایک مقناطیسی طاقت رکھنے والا نوجوان جو زراعتی کالج کا گریجوایٹ ہے۔ انہیں زراعت کے مفید طریقے سکھاتا رہتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں کسی شخص نے ہندوستان کی ایسی اعلیٰ خدمت نہیں کی۔ جیسی کہ مسٹر دیودھر نے۔ جو اِس سوسائٹی کا سینئر ممبر ہے۔ اُس نے اپنی زندگی عورتوں کے لئے ایک ٹریننگ کالج قائم کرنے کے واسطے وقف کر دی ہے۔ نوجوان بیواؤں کی معقول تعداد استانیوں دائیوں اور نرسوں کا کام سیکھتی ہے۔ یہ کالج کس قدر مفید ہے۔ جس کی طالبات سینکڑوں کی تعداد میں دیہات کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

چند کانگرسی لیڈروں سے ملاقات

میں چند کانگرسی لیڈروں سے جیل میں جا کر ملا۔ اُن میں سے سب سے

اعلیٰ فطرت اور شخصیت کی طاقت رکھنے والے پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ جو ایک متمول برہمن خاندان کے فرزند ہیں۔ انگلینڈ کی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں وہ کانگرس کے بائیں بازو کے لیڈر ہیں۔ مجھے الہ آباد جیل میں اُن سے ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اُن سے تنہائی میں دو گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ ایک گلہری کے سوا جو ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ وہاں تیسرا شخص کوئی نہ تھا اُن کی عمر ۴۰ سال کے قریب ہے۔ جس قدر ہندوستانیوں سے میں ملا ہوں۔ اُن سب سے زیادہ تخیل اور تڑپ اُن میں پائی گئی۔ انہیں صفات کی وجہ سے کوئی لیڈر دلیر ہوتا ہے۔ اِن کے مضبوط جسم میں اعصابی طاقت موجود ہے۔ یہ شخص جنگجو ہے۔ میں نے کبھی انہیں پبلک میں تقریر کرتے نہیں سُنا۔ لیکن اُن کی بعض تحریریں نظر سے گزری ہیں۔ جن میں اعلیٰ درجے کی فصیح البیانی پائی جاتی ہے۔ وہ مہاتما گاندھی کے فلسفے کے قائل نہیں ہیں نہ وہ قدیم ہندوستانی رسم و رواج اور مذہب کے قائل ہیں۔ ان کا مطمح نظر تمام انسانوں کے ساتھ ہمدردی کا نہیں۔ بلکہ وہ سوشلسٹ ہیں۔ انہیں یہ وہم نہیں ہے۔ کہ دولت کی تقسیم کی کش مکش کے بغیر کسانوں کی حالت درست ہو سکتی ہے۔ زمینداروں کی جماعت سے جنگ کرنے کی ضرورت سے وہ انکار نہیں کرتے۔ اور وہ جانتے ہیں۔ کہ کانگرس نے انہیں اپنا پریذیڈنٹ مقرر کیا ہے۔ اِس لیئے وہ اپنے خیالات کو عمل میں نہ لانے پر مجبور رہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ کہ وہ قوم پرست پہلے اور سوشلسٹ بعد میں سمجھے ہیں۔ لیکن وہ یہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ کہ پہلے قوم کو آزاد ہونا ضروری ہے۔ اِس کے بعد اُسکی مجلسی تعمیر از سرِ نو ہو سکتی ہے۔ وہ مہاتما گاندھی سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے چلن اور روایات کی

یہ خصوصیت ہے۔ کہ وہ بزرگوں کی بجد تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ چیلا آخر عمر تک بڑی عقیدت اور وفاداری کے ساتھ اپنے گورو کی پیروی کرتا ہے۔ اور اس کا حکم بجا لاتا ہے۔ خواہ وہ خود اس بات کا قائل نہ ہو۔ ہم یورپین لوگوں کی خصلت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اغلب ہے۔ کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے ارون گاندھی سمجھوتے کو اسی سپرٹ میں منظور کیا ہو۔ بخلاف اس کے انہیں اس بات کا اطمینان ہوا۔ کہ کراچی کانگرس نے چند ایسے ریزو لیوشن پاس کئے۔ جن سے کانگرس کی سوشل پالیسی کی وضاحت ہو گئی۔ یہ امید کرنا شاید ایک بھرم ہو۔ کہ جب سنجیدگی کیساتھ طبقی کشمکش شروع ہو گی۔ تو اس وقت عوام الناس کی مدد کرتے ہوئے کانگرس کے اندر اتحاد قایم رہیگا۔ ایسا ہوا تو بائیں بازو کے اس ہونہار لیڈر کی زندگی میں تامل اور پس و پیش کا دور آئے گا۔ اگر وہ اس وقت لڑکھڑا گیا۔ تو کم ہمتی اس کا سبب نہ ہوگی۔ جس بات کی گاندھی جی میں کمی ہے۔ کہ ہندوستانی سوسائیٹی کی اقتصادی تعمیر کو وہ بخوبی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ جواہرلال میں نہیں ہے۔ سرونٹس آف انڈیا سوسایٹی کے لبرل خیالات کے ممبر جو بات پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ جواہرلال نہرو کر سکتے ہیں۔ یعنی وہ لوگوں میں اپنی شخصیت کی طاقت سے لوگوں میں جوش و خروش پیدا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں

نوٹ:۔ ہندوستان میں اور بھی کئی لیڈر تھے۔ اور ہیں۔ جو سوشلزم کے زیر اثر تھے۔ لالہ لاجپت رائے مرحوم کا ارادہ تھا کہ ایک سوشلسٹ پارٹی قایم کیجائے۔ ان کے جانشین اخبار پیپل کے ایڈیٹر مسٹر فیروز چند اور پروفیسر برج نارائن نے جبکہ میں لاہور میں تھا سوشلسٹ پارٹی قایم کی تو پنجاب کی سوشلسٹ پارٹی سیکنڈ اور تھرڈ انٹرنیشنل سے کچھ تعلق نہیں رکھتی مسٹر سبھاش چندر بوس کلکتے کے بیدار مغز ممبر بھی سوشلسٹ ہیں۔ وہ ٹریڈ یونین کانگرس کے پریذیڈنٹ ہیں۔

کہ لیڈری کے وہ دوسرے ضروری لوازمات جو مہاتما گاندھی کو بدرجہ اتم حاصل ہیں۔

پنڈت جواہر لال میں موجود ہیں یا نہیں۔ یعنی عام لوگوں کی مزاج دانی اور قدیم ہندوستانی روایات کو سامنے رکھ کر چلنے کی قابلیت ممکن ہے کہ پنڈت جواہر لال یورپینوں کی سی عقل و خرد رکھتے ہوں۔ یا شاید انہوں نے میرے سمجھانے کی غرض سے اپنے خیالات کی یورپین ڈھنگ سے ترجمانی کی۔ جس لیڈر کو ہندوستانی عوام میں سوشلزم پھیلانا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عوام الناس اُسے اپنے میں سے ایک سمجھیں۔ اُسے یورپین خیالات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔

بنگالی لیڈر

بنگال مختلف قسم کا ہندوستان ہے۔ قدرت نے بھی اس کی حد بندی کی ہے۔ مغرب کے تپتے ہوئے صحرا اور شمال کے تشنہ میدانوں کے بعد یہاں کا علاقہ نہایت سرسبز نظر آتا ہے۔ یہاں پانی ہر جگہ افراط سے ہے۔ آدمی نہروں اور دریاؤں اور نالوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ اس صوبہ میں ہندوستانی تمدن قدیم تر اور پختہ تر ہے انگریزی تعلیم میں عرصۂ دراز تک ترقی کرنے کے بعد وہ اپنے لٹریچر کو شاندار بنا رہا ہے۔ اس کا مذاق نفیس ہے۔ جس نے باقی ہندوستان کو ابھی مس نہیں کیا۔ ہندوستانی تخیل اپنی اصلی حالت پر آ رہا ہے۔ کلکتے میں لوگ گاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس انداز سے جس طرح کہ آئرلینڈ

کا دماغ سیاسی آزادی حاصل کرنے سے چند روز پہلے عمل کرتا تھا۔ بمبئی
تجارتی صوبہ ہے۔ دلی سیاسیات میں غرق ہے۔ لیکن کلکتہ سرگرمی کے
ساتھ علمی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ قومی جدوجہد میں بنگال خود اپنی
روایات رکھتا ہے۔ کیونکہ اُس نے گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کے پیغام
کو پورے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ اس نے نمک بنایا
اور کھدر پہنا۔ لیکن اہنسا پر عمل کیا یا نہیں۔ اس کے متعلق یقینی طور پر نہیں
کہہ سکتے۔ نوجوانوں کی نسل دہشت انگیزی اور سنسنیوں کے طرز عمل پر مائل
ہے۔ یہاں لوگ دوسری فضاء میں رہتے ہیں۔ اور اُن کا مزاج دوسری
قسم کا بن جاتا ہے۔ وہ نفاست پسندی سے زیادہ بہرہ اندوز ہیں۔

انہوں نے زمانۂ حال کے ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ
منڈلوں میں گانے والوں کے طور وطریق سے موسیقی کو آزاد کر رہے ہیں۔ وہ
نئے نئے سازوں کو بکثرت استعمال میں لاتے ہیں۔ مغربی لوگوں کے
کان ہندوستانی موسیقی سے خواہ مانوس نہ ہوں۔ لیکن رابندر ناتھ ٹیگور
کے گیتوں میں ایک خاص شیرینی ہے۔ کاش کہ میں ان متین اور دلکش
ناچوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کر سکتا۔ کہ کس طور سے بنگالی لڑکیاں
شاعرِ بنگال کے گیتوں کے مفہوم کا اپنی نقل وحرکت میں اظہار کرتی ہیں

یہاں میں نے ایک اور آشرم دیکھا۔ جو دوسرے آشرموں سے
بالکل مختلف ہے۔ یہ سر جگدیش چندر بوس کی نباتاتی لیبارٹری ہے
اس کے خانوں میں برقی بیٹریاں لگی ہوئی تھیں۔ اور نہایت نازک
آلات جو نباتات کے تاثرات کا صحیح اندازہ کرتے ہیں۔ درختوں
کے متعلق سر جگدیش کی دریافت نے نباتات کے سائنس میں انقلاب

پیدا کر دیا ہے۔ یہاں بھی اُن کے چہلوں میں ہندوستانی فراست کا
ایک نیا پہلو دیکھنے میں آتا ہے۔ اور وہ مذہب کی سی عقیدت کے
ساتھ اپنے کام میں منہمک ہیں۔ کلکتے میں صرف یہی ایک لیبارٹری
نہیں ہے۔ جو حقیقی ریسرچ کا کام کرتی ہے۔ طبیعات کے متعلق
نوبل پرائز حال میں اِس یونیورسٹی کے پروفیسر سر رامن کو ملا ہے
ان سب باتوں کا اِس کتاب کے منشا سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن
مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ شاید اِسی اذکی الحسن اور بیدار مغز بنگالی
تمدن سے وہ شے پیدا ہو۔ جس کی ہندوستان کے دماغ کو تربیت
دینے کے لئے ضرورت ہے۔ کلکتے کی میونسپلٹی جو اگرچہ سیاسیات
میں سرگرمی سے حصّہ لیتی رہی ہے۔ نہایت عمدہ تعمیری کام سرانجام
دے رہی ہے۔ مسٹر سبھاش چندر بوس نے بجائے فخر کے ساتھ مجھے
دکھلایا۔ کہ کمیٹی اِس بڑے صنعتی شہر کے بچوں کو دودھ مہیا کرنے کے
لئے کیا کچھ کر رہی ہے۔ اُس نے نہ صرف زچاؤں کے لئے ہسپتال
اور کلینک بنائے ہیں۔ بلکہ کمیٹی کی طرف سے دائیاں بھی مقرر ہیں
جس کی وجہ سے شہر میں پیدا ہونے والے ۳۵ فیصدی بچوں کو
تربیت یافتہ دائیوں کی خدمات حاصل ہوتی ہیں۔ اُس کے بچوں کی
۸۰ فیصدی تعداد مدرسوں میں داخل ہے۔ لازمی تعلیم نہ ہونے کی
صورت میں اور افلاس کی اِس حالت میں یہ تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ وہ
مجھے ایک اپنا ابتدائی مدرسہ دکھانا چاہتے تھے۔ آگرہ کے قریب
ایک گاؤں میں جو ایک مدرسہ میں نے دیکھا تھا۔ اُس کی یاد ابھی
تک میرے دماغ میں تازہ تھی۔ اِس لئے جب تک میں مسٹر چیٹرجی

سے ندملا۔ جنہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی ہے۔ اور جو کمیٹی کے اِس
مدرسے کو چلا رہے ہیں۔ مجھے اُمید نہ تھی۔ کہ میں کسی مُفید تعلیم گاہ کا معائنہ
کرونگا۔ لیکن دوپہر ہونے سے پہلے میرے دل پر نقش ہو گیا۔ کہ میں نے
ہندوستان کی شخصی ملاقاتوں میں سے ایک کو دیکھا ہے۔ سکول کی عمارت
کچھ وسیع نہ تھی۔ پہلے ہم نے وہ کمرہ دیکھا جس میں لڑکے مٹی کے سانچے
بناتے تھے۔ اُن کا کام حیرت انگیز ہے۔ وہ جانوروں کے چھوٹے چھوٹے
مجسمے ایسے بناتے تھے۔ کہ اصل اور نقل میں ذرا فرق نہ تھا۔ ہم ایک جماعت
میں ٹھیرے۔ جہاں براہ راست طریقے سے انگریزی سکھائی جاتی تھی۔
انہوں نے کوئی زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ لیکن یہ لڑکے جتنا جانتے تھے وہ
سچے۔ محاورے اور گرامر کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھا۔ بعد ازاں میں
اور ٹیر سر ٹیپیئرجی کے ساتھ ایک جماعت میں گیا۔ اُستاد کھدر میں ملبوس
زمین پر بیٹھا تھا۔ اور وہ مٹی سے کوہستان ہمالہ اور شمالی ہند کے دریاؤں
کا ماڈل بنا رہا تھا۔ ہر ایک لڑکے کی نظر اُستاد کی طرف تھی۔ اور ہر ایک
کا کان اُس کے الفاظ پر لگا ہوا تھا۔ لڑکوں میں سے کسی نے بھی ہمیں جنہوں
کو ہم دروازے پر کھڑے تھے نہ دیکھا۔ ہم نے اُستاد سے چند باتیں
کہیں۔ میں مُڑ کر اس جماعت میں گیا۔ لیکن پھر بھی ہر ایک شاگرد کی نظر
اُستاد پر تھی۔ اور جب میں دروازے پر کھڑا تھا کسی نے میری طرف
دھیان نہ دیا۔ مجھے بنگالی زبان کا ایک لفظ نہیں آتا۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا
ہوں۔ کہ میں نے اُس سے اچھا اُستاد کہیں نہیں دیکھا۔ اگر تمام ہندوستان
اِس سکول میں تعلیم حاصل کرے۔ تو دُوسری نسل ہر مسئلہ کو جو اُسے پیش
آئے۔ حل کر لیگی۔

ساتواں باب

ہندوستان مفلس کیوں ہے؟

زمانہ قدیم کی یہ کہاوت کہ ہندوستان سب سے زیادہ متموّل ملک ہے، جس کی وجہ سے حملہ آور بار بار اس پر چڑھ کر آئے۔ مدّت سے تقویم پارینہ بن چکی ہے۔ شاید خوشحالی کے دَور یہاں کبھی آئے ہوں۔ لیکن اب یہاں مفلسی کا یہ عالم ہے کہ اس کا صحیح قیاس کرنا بھی دشوار ہے۔ ہر شخص اس اعداد و شمار سے واقف ہے۔ جس کے ذریعے حساب دانوں نے اس کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔ لارڈ کرزن نے ۱۹۰۱ء میں اپنی وائسرائی کے زمانہ میں ایک سرکاری دستاویز شائع کی تھی۔ جس میں ہندوستان کی آبادی کی آمدنی کا فی کس دو پونڈ یعنی ۳۰ روپے سالانہ تخمینہ کیا گیا تھا۔ اس صدی کے شروع کے برسوں میں کچھ اقتصادی ترقی رُونما ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں مسٹر فنڈلے شیراز ڈائرکٹر شمار و اعداد نے تخمینہ کیا کہ ہر ایک ہندوستانی کی آمدنی بحساب اوسط ۵۰ روپے سالانہ ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں۔ اس کا مقابلہ جنگ شروع ہونے سے پہلے دُوسرے ملکوں سے کرنا چاہئے۔ سر جوسٹیفہ سٹیمپ کے تخمینے کے مطابق برطانیہ کی فی کس اوسط آمدنی ۵۰ پونڈ۔ امریکہ کی ۷۲ پونڈ۔ جرمنی کی ۳۰ پونڈ اور جاپان کی ۶ پونڈ تھی۔ یہ باور

کرنے کی وجہ موجود ہے۔ کہ ترقی جاری رہی۔ کیونکہ مدراس کے متعلق ایک سرکاری تخمینہ ہے۔ کہ ۱۹۲۰ء میں وہاں فی کس آمدنی کا اوسط ۱۰۲ روپے تھا۔ گویا کہ اصلی آمدنی میں ۲۰ سال کے عرصے میں ۴۴ فیصدی ترقی ہوئی تھی ۱۹۲۳ء میں پروفیسر شاہ اور پروفیسر کھمباٹا نے احاطہ بمبئی کی بابت تخمینہ کیا کہ وہاں فی کس آمدنی ۷۴ روپے ۲ آنے سالانہ بڑھ گئی ہے۔ صحیح اندازہ کرنا تو ناممکن ہے۔ لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ابتدائے صدی سے لیکر جنگ کے شروع ہونے تک ترقی کی رفتار تیز رہی تھی۔ لیکن اگر کوئی سیاح ہندوستانیوں کے فاقہ زدہ جسموں اور اُن کے خراب وخستہ گھروں اور اُن کے چیتھڑوں اور اُن کے گاؤں کی سڑکوں کو دیکھے۔ تو ضرور اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ ہندوستانیوں کی آمدنی باشندگان انگلینڈ کی آمدنی کی نسبت نہایت ہی قلیل ہے۔ آخر اس افلاس کا کیا سبب ہے؟

ہندوستانی رسم ورواج اور مذاہب دولت کے پیدا کرنے میں کہاں تک مخل انداز ہیں۔ اور کہاں تک ہندوستان کے انگریز حکام کی سابقہ اور موجودہ پالیسی پر اُس کا الزام عاید ہوتا ہے۔ آیا یہ بدیشی گورنمنٹ اس کا انسداد کر سکتی ہے۔ یا کہ یہ ایسا کام ہے۔ کہ صرف قومی گورنمنٹ ہی اس کو سرانجام دے سکتی ہے۔ اِس افلاس کے پیدا کرنے میں سودخوار اور مہاجن کا کہاں تک ہاتھ ہے۔ اور ٹیکسوں کی زیادتی یا ہندوستان سے ولایت کو دولت کا کھچا جانا جس کی ہندوستانی اکثر شکایت کیا کرتے ہیں۔ کہاں تک اِس کے ذمہ وار ہیں۔

اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ دولت پیدا کرنے کے لیئے مزدوری کی طاقتیں کس قدر ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستان

کی آبادی ۳۱ کروڑ ۹ لاکھ تھی۔ منجملہ اس کے ۷۲ فیصدی زراعت کے کام
میں مصروف تھی۔ اور ۱۰½ فیصدی صنعتی کاموں میں۔ عورتیں۔ مزدوری کا
کام بہت کم کرتی ہیں۔ ابھی تک وہ ٹائپسٹ یا کلرک نہیں ہیں۔ یورپ
کی نسبتاً ہندوستان کے کارخانوں میں عورتیں نسبتاً کم کام کرتی ہیں۔ اگرچہ
مہاتما گاندھی کے پرچار نے اُن کی بڑی تعداد کو دیہات میں اور شہروں میں چرخہ
کاتنے پر مائل کر دیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں پردہ کا رواج ہے۔ (اگرچہ
یہ رواج ٹوٹ رہا ہے) اعلیٰ ذاتوں کی عورتیں جن میں کاشتکاروں کی عورتیں
بھی شامل ہیں۔ گھروں کے باہر قدم نہیں نکالتیں۔ اور وہ اپنے شوہروں
کے لئے کھیتوں میں کھانا لیکر بھی نہیں جاتیں۔ بخلاف اُس کے نیچی ذاتوں کی
عورتیں عادتاً کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ اور شہروں میں وہ مزدوری کا کام کرتی
ہیں۔ اور بندرگاہوں اور کوئلے کی کانوں اور عمارتوں کی تعمیر کے کام پر بوجھ
اُٹھاتی ہیں۔ جب وہ بھاری بوجھ اٹھا کر سر پر چلتی ہیں۔ تو اُن کی شریفانہ چال
کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے۔ کہ نازک اندام، جسم لطیف سے
ایسا سخت کام کیوں لیتے ہیں۔ بہرحال یہ بات ظاہر ہے۔ کہ مغرب کی نسبت
دولت پیدا کرنے میں ہندوستان کی عورتیں کم ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اور اسکی
ذمہ داری ہندوستانی عقائد اور رسم و رواج (پردہ اور کمسنی کی شادی) پر
عاید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں کام کرنے والی طاقتوں میں سے
تعلیم یافتہ لوگوں کو منہا کر دینا چاہیئے۔ جنہیں کوئی مستقل کام نہیں ملتا۔ اسکی
ذمہ داری زیادہ تر غلط طریقۂ تعلیم پر عاید ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مزدور
جسمانی طاقت اور کمالیت اور طاقت برداشت میں کسی مغربی نسل کا مقابلہ
نہیں کر سکتے۔ یہ زندگی کے ادنیٰ معیار کا نتیجہ ہے۔ مہاتما گاندھی سے لیکر

بڑے بڑے انگریز تک یہ کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان کی آدھی آبادی کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کاشتکاروں میں اچھے اچھے جوان نظر آتے ہیں سکھوں کو تو دیکھنا چاہئے۔ مرہٹے ورزشی آدمی ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں بھی عورتیں چھوٹے قد کی اور نازک نظر آتی ہیں۔ غریب علاقوں کے شہروں اور دیہات کے قلی پورے قد کے نہیں ہوتے۔ اور ان کے پٹھے پوری نشوونما حاصل نہیں کرتے۔ گویا قدرت نے ایک ایسی پست قد قوم بنا دی ہے جو تھوڑے عرصے کیلئے مصیبت کے دن پورے کرتے ہیں۔ ان کی خوراک میں نہایت ہی کم پروٹیڈ اور ویٹمن ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی اوسط عمر ۲۲ سال ہے۔ جبکہ انگریزوں کی ۵۵ سال ہے۔ ان شہری اور دیہاتی مزدوروں کی صحت اچھی نہیں ہوتی۔ وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ تندرستی اور طاقت کیا ہوتی ہے۔

آل انڈیا میڈیکل ریسرچ کانفرنس نے ۱۹۲۶ء میں اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ کہ ہندوستان میں ایسے امراض سے جنکو روکا جا سکتا ہے پچاس ساٹھ لاکھ موتیں ہر سال ہوتی ہیں۔ اور ہر شخص کے ان امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سال میں دو تین ہفتے ضایع ہو جاتے ہیں۔ اور قابل امراض علاج اور غلط خوراک کی وجہ سے اُن کے کاموں میں بیس فیصدی خلل پڑتا ہے۔ اور صرف پچاس فیصدی بچے اس عمر کو پہنچتے ہیں۔ کہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔ حالانکہ یہ نشا سب آسانی سے اسی یا نوے فیصدی تک بڑھایا جا سکتا ہے قابل علاج امراض میں سے سب سے زیادہ مہلک ملیریا اور خون کی کمی کا مرض ہے۔ خون نہ پیدا ہونے کا سبب ہکورم ہے۔ یہ جراثیم صفائی کی عادت نہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ملیریا سے ہر سال دس لاکھ موتیں ہوتی ہیں۔ اور بیس لاکھ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور پچاس لاکھ آدمی بیمار

ہوتے ہیں۔ جن کا ہاسپٹلوں میں علاج ہونا چاہیئے تھا۔ جن علاقوں میں
ملیریا کا زور رہتا ہے۔ وہاں تقریباً ہر ایک بچے کی شروع سے ہی تلی بڑھی
ہوئی ہوتی ہے۔ اور اُن میں کبھی پورے طور پر طاقت نہیں آتی۔ روپیہ خرچ
کرکے اور تنظیم کیساتھ ان دونوں بیماریوں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ کثرتِ
اموات کے لیئے آب و ہوا کو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ جب یہ دیکھا جاتا
ہے۔ کہ ہندوستان میں ۱۹۱۸ء میں باسٹھ ہزار موتیں ہوئیں۔ اور ۱۹۲۲ء میں
چوبیس ہزار۔ جبکہ انگلینڈ میں ۱۹۲۲ء میں ۱۲ء۲۳ فی ہزار موتیں ہوئیں
تھیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اتنا کیوں فرق ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ
بنارس چھاؤنی میں ۱۲ء۳ فی ہزار موتیں ہوئیں۔ اور شہر بنارس میں ۱۱ء۶۴ فی
ہزار تو پھر کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ چھاؤنی اور شہر کی آب و ہوا یکساں
ہے۔ لیکن چھاؤنی کی آبادی کو اچھی خوراک ملتی ہے۔ اور ہوادار مکانوں
اور بارکوں میں رہتی ہے۔ اُسکے محلے کشادہ ہیں۔ مگر شہر میں۔ مکانات تنگ و
تاریک ہیں۔ اور آبادی کو خوراک کافی نہیں ملتی۔ اور اُس کی تنگ گلیوں میں
صفائی اور حفظانِ صحت کے ہر ایک اصول کو توڑا جاتا ہے۔ اگر کسی نے
کلکتے اور بمبئی کی بعض غلیظ گلیوں کو دیکھا ہے۔ تو اُسے یہ سُن کر تعجب نہیں ہوتا
کہ ۱۹۲۲ء میں علی الترتیب وہاں ۳۱۷ اور ۴۱۹ فی ہزار نوزائیدہ بچے مرگئے
جبکہ لنڈن میں بچوں کی شرح اموات ستر فی ہزار ہے۔ تعجب تو یہ ہے۔ جو بچے
ایسی گندی آب و ہوا میں بچ گئے۔ وہ زندہ کیوں کر رہے۔ بعض بچے افیون
سے مر جاتے ہیں۔ جو دس میں سے نو مائیں اُن کا رونا بند کرنے کے لئے
دیدیتی ہیں۔ کمسنی کی شادی اور چھوٹی عمر میں بچوں کا پیدا ہو جانے اور غلط
خوراک کھانے کی وجہ سے بچے کمزور رہتے ہیں۔ اور یہ کمزوری عمر بھر اُن

سکے ساتھ رہتی ہے۔ ہندوستان میں دودھ کی بھی قلت ہے۔ اور جو بازاروں میں ملتا ہے۔ وہ عموماً خراب اور پانی ملا ہوتا ہے۔ چاول، اور دوسرے غلے جو کھائے جاتے ہیں۔ اُن میں چکنائی اور پروٹیڈ نہیں ہوتا۔ اور نشاستہ زیادہ ہوتا ہے۔ آم کی فصل کے سوا دیہاتیوں کو کبھی پھل نصیب نہیں ہوتے۔ شہد گاجر مولی وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ گیہوں ایک نعمت سمجھی جاتی ہے۔ جو صرف تجارت وغیرہ کی غرض سے بوتے ہیں۔ جو چاول پالش کئے گئے ہوں۔ وہ نہایت ہی خراب خوراک ہیں۔ روز ایک ہی قسم کا کھانا کھایا جاتا ہے جس میں نمک کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور چونکہ مزدوروں کو پوری مقدار میں غذا نہیں ملتی۔ اس لئے وہ اپنی تندرستی اور طاقت قائم رکھنے کے لئے آمدنی پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر ہندوستان کے غلوں کی تمام پیداوار کا حساب کیا جائے اور آدھ کو چھوڑ کر جو صرف چار فیصدی ہے۔ تو ایک شخص کے حصے میں صرف ۱۰۳ پونڈ خوراک آتی ہے۔ جبکہ بمبئی کے جیلوں میں قیدیوں کو ۱۱۷ پونڈ خوراک دیجاتی ہے۔ اور قحط کے دنوں میں کھدائی کا کام کرنے والوں کو ۱۲۹ پونڈ دی گئی۔

برطانوی ہند میں خواندہ مذکر آبادی کا تناسب ۱۸.۴ فیصدی ہے لیکن تعلیم یافتہ عورتوں کا تناسب صرف ۱.۹ فیصدی ہے۔ مزدوروں کے بچے مدرسوں میں صرف ایک دو سال جاتے ہیں۔ اور جو کچھ پڑھا تھا۔ پھر جلدی سے بھول جاتے ہیں۔ مزدور لوگ عموماً یہاں تک جاہل ہوتے ہیں۔ کہ گھنٹے میں وقت نہیں دیکھ سکتے۔ اور زراعت میں ترقی نہیں کر سکتے۔ اور سودخواروں اور زمینداروں کی چالاکی کا آسانی سے شکار رہ جاتے ہیں۔ چونکہ جسمانی طور پر وہ کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کے دل میں ترقی

کی کوئی اُمنگ پیدا نہیں ہوتی۔ اور انہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہوتا۔
جیسا کہ مغرب کے مزدوران کو ہوتا ہے۔ اور ذات پات کی قید کی وجہ سے
وہ بمیات کے بندھن میں جکڑے رہتے ہیں۔ مزدوروں کی اس طاقت
سے دولت پیدا کرنے میں ٹھیک طور پر کام نہیں لیا جاتا۔ مزدوروں کا ۹۰ فیصدی
حصہ زراعت کے کام میں لگا ہوا ہے۔ جو سال میں چار مہینے بیکار رہتے ہیں
غرضیکہ ہندوستان کی مفلسی کا سبب یہ ہے۔ کہ صرف آدھا ہندوستان کام
کرتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی۔ کہ یہاں زراعت کے طریقے دقیانوسی ہیں ہندوستانی
کسان گیہوں کے فصل کے لئے ایک ایکڑ زمین پر چالیس دن محنت کرتے
ہیں۔ جبکہ امریکہ میں کلوں کی مدد سے اس کام کے لئے ایک دن کا بھی
ایک حصہ کافی ہوتا ہے۔ اور پھر یہاں کی اور وہاں کی گیہوں میں بڑا فرق
ہے۔ ایک مشکل یہ ہے۔ کہ اگر زراعت کو ترقی دی جائے۔ اور بہتر طریقوں
سے کام لیا جائے۔ تو بہت کم دیہاتیوں کے لئے کام رہ جاتا ہے۔ اور باقی
بیکار ہو جاتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے۔ کہ ترقی زراعت کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ
کاشتکاروں کی آمدنی بڑھ جائیگی۔ تو کپڑوں۔ فرنیچر۔ اور اچھے مکانوں بلکہ
سستی عیش کی چیزوں کا مطالبہ بھی بڑھیگا۔ تو پھر صنعت بھی ترقی کرے گی
وہ مرغیاں پالنے کا کام بھی نہیں کرتے۔ غالباً اس وجہ سے کہ یہ جان کی
ہتیا کرنا پاپ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ نسل ان قیود سے نکلی جاتی ہے۔ بنگال
میں تو برہمن تک نہ صرف انڈے کھا لیتے ہیں۔ بلکہ مچھلی بھی کھاتے ہیں مچھلیوں
کی نسل کی افزائش کے بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اور پھلوں کو
محفوظ کرنے کی صنعت قائم ہو سکتی ہے۔ ریشم کی پیداوار بھی بڑھائی جا سکتی
ہے۔ مگر یہاں بھی مذہب مانع آتا ہے۔ اگرچہ ہندو بغیر کسی پس و پیش کے

ریشم کے کپڑے بن سکتے ہیں۔ آلات بنانے اور رسیاں بٹنے کا کام بھی چل سکتا ہے۔ لاکھ کی تجارت کو بھی چلایا جا سکتا ہے۔

نیز ہندوستان کو اپنے لئے خود کپڑے بنانے چاہئیں۔ اور ان کے لئے ایسے مکانات تیار کرنے چاہئیں۔ جو صحت بخش ہوں۔ ان کی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں دیہات کی فالتو آبادی کے لئے کام مہیا ہو سکتا ہے۔ جب دو شخص اس قدر گیہوں پیدا کر سکینگے۔ جس قدر کہ آج کل چار آدمی کرتے ہیں۔ تو تیسرے کو کپڑے بننے کا کام کرنا چاہئے اور چوتھے کو مکان تعمیر کرنے کا۔ زراعت کی فالتو پیداوار سے کئی صنعتیں جاری کی جا سکتی ہیں۔ جس طرح کہ روس نے گندم کے بدلے مشینیں اور مشینری خرید لیا ہے۔ ہندوستان کے پاس اس قسم کی کوئی دولت نہیں ہے۔

جب ہندوستان اپنی صنعتی ترقی کرنے کے لئے آزاد ہو گا۔ تو دو طرح کے خیالات رکھنے والے ہندوستانیوں میں بڑا جھگڑا ہو گا۔ مہاتما گاندھی کے ہم خیال لوگ دیہات کی دستکاری کو بحال کرنے کی کوشش کرینگے۔ اور بمبئی کے مالکان کارخانہ جات اور ہندوستانی سرمایہ دار مشینوں سے کام لینے پر زور دینگے۔ چرخے کو زندہ کرنا حق بجانب ہو سکتا ہے کیونکہ کاشتکاروں کے لئے بیکاری کے مہینوں میں اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا لیکن چرخہ ایک نہایت وقیانوسی آلہ ہے۔ اگرچہ کانگرس نے موجدوں کو دعوت دی ہے۔ کہ روئی دھننے اور سوت کاتنے کے لئے بہتر آلات ایجاد کریں۔ جو ہاتھ سے چلائے جا سکیں۔ بعض اضلاع میں سرکاری محکمہ صنعت سے ایک اعلیٰ درجے کا ڈرم جاری کیا گیا ہے۔ جو معمولی کرگھوں کی نسبت زیادہ کام کرتا ہے۔ چرخے کی خوبی یہ ہے۔ کہ وہ ایک سادہ اور سستا

آلہ ہے۔ اگر کاریگروں کے لئے زیادہ قیمتی آلات بہم پہنچائے گئے۔ تو اُن کے لئے سرمائے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اور پھر انہیں کوآپریٹو سوسائٹی کا ممبر بنانا ہوگا تاکہ ان کے مال کے لئے پھر منڈی تلاش کی جائے۔ جولاہوں کو کوآپریٹو سوسائٹی میں شامل کرنے کی کوششوں میں بہت کم کامیابی ہوئی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ سودخوار مہاجنوں کے غلام ہیں۔ سردست کپڑا بننے کا کام ان جولاہوں تک محدود ہے۔ جن کے آباؤ اجداد یہی کام کرتے آئے ہیں۔ ہر ایک گاؤں میں ایک جولاہا اور ایک کمہار موجود ہے۔ اگر سب بے کار کاشتکاروں کے لئے کام مہیا کرنا ہے۔ تو ذات پات توڑنی پڑیگی۔ اور ہر شخص کو کوآپریٹو ورکشاپ میں کام کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس صورت میں بجلی کی طاقت سے کیوں نہ کام لیا جائے۔

مہاتما گاندھی کو مشینوں کے ذریعے صنعتی کارخانے کھول لینے سے جن وجوہات سے نفرت ہے۔ اُن میں سے بعض معقول ہیں۔ اگر کسانوں کے لئے ضروری ہو۔ کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر جہاں انہیں دھوپ اور صاف ہوا اور نیچر کے خوبصورت مناظر حاصل ہیں۔ کسی بڑے شہر کے گندے اور گنجان لور غلیظ مکانوں میں جا کر رہنا پڑے۔ اور فورمینوں کے ظلم اُٹھانے پڑیں۔ تو ان مصیبتوں سے بچنے کے لئے قوم کی دولت کے بڑے حصے کو قربان کر دینا بُرا نہیں۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہے۔ اوسط درجے کا آرام دہ اور صحت بخش مکان ہندوستان میں ۲۶ پونڈ میں بن سکتا ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کو چاہیئے کہ گندے مکانات کو مسمار کر دیں۔ رہا یہ سوال۔ کہ دیہاتیوں کو اپنے گاؤں سے محبت ہوتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے بڑے شہر میں رہنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ لیکن جب بجلی سے کام لیا جائے گا۔ اور کرایہ سستا

ہو جائیگا۔ تو اعتراض باقی نہ رہیگا۔ اور ممکن ہے۔ کہ دیہات میں ہی کواپریٹو ورکشاپ اور فیکٹریاں جاری ہو جائیں۔ مگر اِن کاموں کے لیئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ہر شخص نے سُنا ہوگا۔ کہ ہندوستان میں کس قدر سونا اور زیورات ہیں۔ گزشتہ ۵ سال میں ۳۰۵ کروڑ کا سونا ہندوستان میں آیا۔ یہ سرمایہ کے کام میں نہیں آتا۔ اور اِس کا بہت تھوڑا حصّہ بنکوں میں جاتا ہے۔ بلکہ وہ صندوقوں اور پٹیروں میں بند ہے۔ مندروں میں جمع ہے۔ اور عورتوں کے زیورات بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ زمین میں دفن کر کے بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ کارروائی قدیم الایام سے جاری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جذبۂ حُبّ الوطنی اس سونے کے ایک حصّے کو زمین سے باہر نکلوا لے۔ عورتیں ہندوستان کو بدیشی حکومت سے آزاد کرانے کی خاطر اپنے زیورات کھُلے دل سے مہاتما گاندھی کی نذر کر دیتی ہیں۔ اگر ہندوستان میں قومی حکومت ہوئی۔ تو کیا وہ ملک کی صنعتی ترقی کے لیئے اِس سونے کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی؟ آبادی کی ترقی کے ساتھ صنعتی ترقی نہیں ہوئی وسائل آمدورفت کے بڑھ جانے سے قحط دُور ہو گئے۔ لڑائیوں کے بند ہو جانے سے آبادی اور بھی بڑھ گئی۔ برطانوی حکومت میں ہندوستان نے نیم فاقہ مستی کے ساتھ امن کا فائدہ اُٹھایا۔ اور ڈیڑھ سو سال میں اُس کی آبادی دوچند ہو گئی۔ دُوسرے فوائد کا بھی یہی نتیجہ نکلا۔ مغربی خاتمان نے ریلوے اور سڑکیں بنائیں۔ جن سے بیشمار مجلسی۔ سیاسی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے۔ لیکن ان کی بدولت دیہات کے کاریگروں کو نقصان پہنچا۔ سڑکوں کے ذریعے مشینوں کے بنے ہوئے سستے مال کا سیلاب آگیا۔ اور آج کل موٹر لاریاں دیہاتی صنعت کی بربادی کو مکمل کر رہی ہیں

کیونکہ لاریوں کے ذریعے بہت تھوڑے کرائے پر اُن کے گاہک قریب کی منڈیوں میں چلے جاتے ہیں۔ آخر دیہاتی کاریگروں کو اپنا کام چھوڑنا پڑا۔ اور اپنے گزارے کے لئے زمین جوتنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۹۳۱ء تک زراعت پیشہ لوگوں کی آبادی ۶۱ فیصدی سے ۷۲ فیصدی ہوگئی۔ ہماری سلطنت کے کارناموں کا بدترین اب یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندوستان کی نفیس کپڑے کی تجارت کو بھاری بھاری محصول لگا کر کچل دیا گیا۔ ہمارے اقتصادی اصول حالات کے موافق بدل جایا کرتے ہیں۔ شروع شروع میں ہندوستان کے کپڑے کی درآمد کے مقابلہ میں اپنے کپڑے کی برآمد کو ہم نے اس طرح ترقی دی کہ بھاری محصول لگا کر ہندوستان کی صنعت کو تباہ کردیا۔ لیکن جب مشینوں کے ذریعے سے ہم نے پارچہ بافی میں ترقی کی۔ تو ہم نے فری ٹریڈ کا اصول اختیار کرلیا اور ہندوستان پر بھی اس کو عاید کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے میں ہندوستان دوسرے مہذب ممالک سے ایک صدی پیچھے ہے اور یہ تاخیر فاتحان کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہندوستانی حکومت چاہتی تو دستکاری اور صنعتیں زیادہ دیر تک زندہ رہتیں۔ دوسری سرمایہ داری کا نقصان اٹھانا پڑتا۔ کاشتکاروں کا خون چوسنے والے بھی بہت لوگ ہیں۔ اس کی پیداوار کے گاؤں سے بندرگاہ پہنچنے تک بہت لوگ اس سے فایدہ اٹھالیتے ہیں۔ جو لوگ گاؤں کے مزدوروں کی کمائی پر موٹے ہوتے ہیں ان میں سب سے اول نمبر زمیندار کا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ لوگ سابق راجاؤں کی اولاد سے ہیں۔ جو اپنی حکومت گنوا بیٹھے ہیں۔ بعض نے زمینداریاں خرید لی ہیں۔ بعض سود خوار مہاجن ہیں۔ جنہوں نے مقروض

کاشتکاروں کے کھیت قرق کرا لیتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیکھا۔ کہ ہر جگہ ٹیکس جمع کرنے والے موجود ہیں۔ جو مغلوں کے وقت میں یہی کام کرتے تھے۔ اور اپنی خدمات کے صلے میں کمیشن لیا کرتے تھے۔ یا تو ناواقفیت سے یا کسی خاص حکمت عملی کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان لوگوں کو زمیندار تسلیم کر لیا۔ اور انہیں زمین کا مالک مان لیا۔ بدقسمتی فاتحان کی حکمت عملی بھی ہو سکتی ہے۔ کہ انہوں نے ان نئے اُمرا کی وفاداری خرید کر انہیں کاشتکاروں کے لوٹنے کھسوٹنے کا اختیار دیدیا۔ اس سسٹم کی بدترین صورت بنگال میں پائی جاتی ہے۔ جہاں لارڈ کارنوالیس نے ۱۷۹۳ء میں اسکے نرخ اجناس کی بنیاد پر استمراری بندوبست منظور کر لیا۔ یعنی زمیندار سے لگان میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہر بیس سال کے بعد مالیہ بڑھا سکتا ہے۔ اور ۱۲۰ سال کے عرصے میں بڑی عمدگی کے ساتھ زمینداروں نے اس اختیار کا فائدہ اٹھایا ہے۔ مستقل بندوبست کے تحت میں کاشتکاروں سے جو مالیہ وصول ہوتا ہے۔ تقریباً اس کا چوتھا حصہ گورنمنٹ کے خزانے میں جاتا ہے اور تین چوتھائی زمیندار کی جیب میں رہتا ہے۔ صوبجات متحدہ میں ہر ۳۰ سال کے بعد بندوبست ہوتا ہے۔ جس کا ۵۵ فی صدی حصہ زمیندار اپنے پاس رکھتا ہے۔ اور باقی سرکار کو دیتا ہے۔ لارڈ رپن کی تجویز تھی۔ کہ جب قیمتوں میں تبدیلی ہو تو لگان میں بھی کمی بیشی ہو لی جائے لیکن برطانوی گورنمنٹ نے پیچھے سے منظور نہ کی۔ قومی قرضے کے متعلق ہندوستانیوں کے بعض اعتراضات بجا ہیں۔ جبکہ وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو معاوضہ قرض سے کر دیا گیا۔ وہ ناجائز تھا۔ کیونکہ یہ قرضہ ہندوستان سے پوچھ کر نہیں لیا گیا۔

ہندوستانیوں کی یہ دلیل بھی زبردست ہے۔ کہ اکثر لڑائیوں کے اخراجات کا کچھ حصّہ ہندوستان کے سر ڈالا گیا۔ حالانکہ ان لڑائیوں سے ہندوستان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ علاوہ ازیں غدر کے بعد ہندوستان سے تاوان وصول کیا گیا۔ افیون کے متعلق چین سے جو لڑائیاں کی گئیں۔ اُس سے برٹش تجارت کو فائدہ پہنچا۔ نہ کہ ہندوستان تجارت کو۔ یا ہنگ کانگ کو ہندوستان کے فائدے کے لئے ملحق نہیں کیا گیا۔ ہندوستانیوں نے کب خواہش کی تھی۔ کہ برما کو فتح کیا جائے؟

اول جنگ افغانستان کی تائید کون کر سکتا ہے۔ ؟ اِس کے جواب میں کہا جاتا ہے۔ کہ یہ قرضے اب ادا ہو چکے ہیں۔ اور بعض برائے نام باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی صحیح جواب نہیں۔ کیونکہ سالہا سال تک ان قرضوں نے ہندوستان کی بچت کو کم کیا۔ جو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے کام آ سکتی تھی۔ اخلاقی پہلو سے ہندوستانی لیڈران قرضوں کے متعلق ڈگری حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ بشرطیکہ یہ دُنیا اخلاقی ہوتی۔ ایک سلطنت نے ہندوستان کو طاقت سے فتح کیا۔ اور اُسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کیا۔ بلاشبہ غیر ضروری اور نامناسب لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن کیا اگر کلائیو پیدا نہ ہوتا۔ تو ہندوستان اِس قسم کی لڑائیوں سے محفوظ رہتا؟

ہندوستانی کہتے ہیں۔ کہ اگر انگریز نہ آتے۔ تو یہ ملک امن کا بہشت ہوتا۔ جس میں نہ تو جنگی ساز و سامان پر اِس قدر خرچ کرنا پڑتا۔ اور نہ خونریز لڑائیوں کے لئے ٹیکس لگانے پڑتے۔ لیکن میں کہتا ہوں۔ کہ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہ آج تک اندرونی خانہ جنگیوں میں ہی مبتلا رہتا۔ لیکن

کوئی زبردست دیسی طاقت ملک کو متحد کردیتی۔ تو کیا وہ فوجی اخراجات کے بوجھ سے محفوظ رہتا۔؟ آخر جاپان کو کس قدر بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں اُسے بحری فوج رکھنی پڑتی۔ ہندوستان اس خرچ سے محفوظ ہے۔

مہاتما گاندھی مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ فوج اور سول سروس کے اخراجات اور لگان اراضی نصف کردینا چاہیئے۔ اور نمک کا محصول موقوف کر دینا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ جب ہندوستان کو اپنے بجٹ پر اختیار حاصل ہوگا۔ تو نمک کا محصول اُڑ جائے گا۔ مہاتما گاندھی کو مطمئن کرنے کے لئے کسانوں کو جو نہایت غریب ہیں ٹیکس سے معاف کردینا چاہیئے۔ کوئی مہذب سلطنت ایسی آمدنی پر ٹیکس نہیں لگائے گی۔ جس میں گذارہ بھی بمشکل ہوسکے۔ رہا اخراجات کا معاملہ سرکاری رپورٹ کے مطابق صوبجاتی اور مرکزی اخراجات کا ۲۲ فیصدی حصہ فوج پر خرچ ہوتا ہے ۲ فیصدی تعلیم پر۔ اور ایک فیصدی حفظان صحت پر۔ ان فوجی اخراجات کا بڑا حصہ بغاوت یا دوسرا غدر ہونے کے اندیشے سے خرچ کیا جاتا ہے ہندوستانیوں کو حال ہی میں کمیشنڈ عہدے دئیے گئے ہیں۔ مگر اب بھی بھاری توپ خانہ کے متعلق ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اعلیٰ درجے کے ہتھیار صرف گورہ فوج کو دئیے جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی سپاہی کی نسبت گورے سپاہی پر چار گنا اور ہائی کمیشنڈ افسر پر ۲۴ گنا زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ آجکل گورنمنٹ بڑی تیزی کے ساتھ اخراجات میں تخفیف کر رہی ہے۔ لیکن اُس کو فوجی اخراجات کم کرنے کی جرأت نہیں ہے کیونکہ وہ ہندوستانی فوج میں اضافہ اور برطانوی فوج میں زیادہ کمی

نہیں کر سکتی۔ اور اسی وجہ سے پولیس جیل اور عدالتوں کا خرچ نہیں گھٹا سکتی۔ جو بغاوت کے انسداد کے لئے قایم ہیں۔

عام انتظامی اخراجات کا بڑا حصّہ انگریز سول افسروں کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ افسر بڑے قابل ہیں۔ چونکہ انہیں اکثر دور دراز گوشوں اور غیر صحت بخش مقاموں میں رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو معاوضے کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی تنخواہیں ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعتوں کے معیار سے بہت زیادہ ہیں۔ میرے خیال میں انگریز افسر جو اس قدر زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ آب و ہوا کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کا دبدبہ قایم رکھنے کی وجہ سے کرتے ہیں اگر کوئی وائسرائے ہندوستان کے افلاس کے خیال سے سنیاسیوں کی سی زندگی بسر کرے۔ تو وہ ہندوستان سے اس قدر احترام حاصل کر سکتا ہے۔ جو شان و شکوہ سے کبھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ ہندوستان کے حکام نے آج تک اس بات کو سمجھا ہی نہیں۔ کہ اگر وہ ملکی آمدنی کو دوچند کر سکیں۔ تو موجودہ بلکہ اس سے بھی زیادہ سرکاری اخراجات لوگ برداشت کر لیں۔



آٹھواں باب

سیاسی نقطۂ نظر

اب یہ کوئی بحث نہیں کرتا۔ کہ ہندوستان کے لئے سوراجیہ مناسب یا ممکن ہے یا نہیں۔ اب وہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کی رفتار نے ہم کو آ پکڑا ہے۔ اگر دو سال پہلے ہم نہیں جانتے تھے۔ کہ تقدیر اپنا فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب ہم جان گئے ہیں۔ جس مؤرخ نے ان دو سال کے واقعات پر غور کیا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اس سے کم عروج پر سبق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۲۹ء کے کرسمس کی شام کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ کانگرس کے ساتھ صلح اور باضابطہ آئینی ترقی ہمارے حیطۂ اختیار کے اندر ہے لارڈ ارون نے جو ایک ہر دلعزیز شخصیت رکھتے تھے۔ اپنی صدق دلی کے ساتھ ہندوستانیوں کو آمادہ کر لیا۔ کہ وہ ہماری نیک نیتی پر یقین کریں۔ انہوں نے پہلی دفعہ ڈومنین سٹیٹس کا جادو بھرا لفظ استعمال کیا۔ اور کہا۔ کہ اس کا جاری کرنا ہندوستان میں برطانوی پالیسی کا منتہائے مقصود ہے۔ اس وعدے کی، نہ تو کوئی تشریح کی گئی تھی۔ اور نہ یہ بتایا گیا تھا۔ کہ درجہ نوآبادیات کس قدر عرصے میں ملیگا۔

لیکن ہندوستانیوں پر اس کا کافی اثر ہوا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی دونوں قوموں
سے لیڈروں کے مابین مساوی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شامل ہو
کی دعوت تھی۔ جس کا ہندوستانی مدت سے مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر شنوائی
نہیں ہوتی تھی۔ اس مہلک غلطی کی آخر کار تلافی کر دی گئی۔ جو سائمن
کمیشن کے تقرر سے سرزد ہوئی تھی۔ جس میں صرف انگریز ممبر شامل تھے
جو یہ فیصلہ کرنے بیٹھے تھے۔ کہ ہندوستان سوراجیہ کے قابل ہے
یا نہیں۔ مہاتما گاندھی نے صرف ایک سوال کیا۔ جو نہائت مناسب تھا
اگرچہ ان کی تحریک کے بائیں بازو کے لوگ انہیں سخت رویہ اختیار کرنے
پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ سوال یہ تھا۔ کہ اگر میں کانفرنس میں شامل
ہو جاؤں۔ تو کیا لیبر گورنمنٹ پرائیویٹ طور پر اس بات کا یقین دلاتی
کہ وہ ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دینے کا آئین معہ تحفظات
کے مرتب کرے گی؟ وائسرائے نے یہ وعدہ دینے سے انکار کر دیا
ممکن ہے۔ کہ ایسے معاملات میں پرائیویٹ وعدہ کرنا مناسب نہ ہو
غرضیکہ ایک سال کی کشمکش میں ہندوستان نے اپنی قوت
ارادی کا مظاہرہ کر دیا۔ کہ وہ اس شے کو حاصل کر کے رہیگا۔ جس کی
بابت لارڈ اردن اور مسٹر میکڈانلڈ نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس
مظاہرے سے پہلے برطانیہ کی عام رائے اس قسم کا وعدہ کرنے کے
لئے تیار نہ تھی۔ وہ سائمن رپورٹ پر عمل کرنے کو آمادہ تھی۔ مگر اس
سے آگے نہیں۔ یہ کسی کو خیال نہ تھا۔ کہ صوبوں میں نیز مرکزی
گورنمنٹ میں ذمہ داری کا عنصر داخل کرنا ضروری ہے۔ اگر اس وقت
مسٹر میکڈانلڈ علانیہ طور پر وعدہ کر لیتے۔ جس کا مہاتما گاندھی نے مطالبہ

کیا تھا۔ تو اغلب تھا۔ کہ دونوں مخالف پارٹیاں اُن کے خلاف کھڑی ہوجاتیں۔ اور اُن کی گورنمنٹ ٹوٹ جاتی۔ مؤرخین کو ماننا پڑیگا۔ کہ اِس عرصے کے درمیان میں سلطنت زیادہ سے زیادہ کیا دے سکتی ہے اور ہندوستان کم سے کم کیا لینا منظور کرسکتا ہے۔ عدم تشدد کی بغاوت اور گورمنٹ کی طرف سے تشدد کا ہونا ضروری تھا۔ مہاتما گاندھی وہ ثبوت پیش کرنے کے لئے مجبور تھے۔ جس کا سیاسی منطق مطالبہ کیا کرتی ہے۔ اور انہوں نے وہ مہیا کیا۔ انہوں نے ثابت کیا۔ جس کا بہت کم لوگوں کو گمان تھا۔ کہ عملی طور پہ ہندوستانی قوم باتفاق رائے اُن کے پس پشت ہے۔ عورتوں کا جوش و خروش اور کسانوں کا ملک کی خاطر اپنی زمین کو بازی پر لگا دینا اور غیر بشکیجو زخموں کی مصیبت اُٹھانے کے لئے مستعدی۔ اس امر کے ثبوت تھے۔ کہ ہندوستان آزاد ہونے پر مصر ہے لنکاسائر نے اِس مظاہرے کا تلخ تجربہ حاصل کیا۔ اور آزمایش کا سال ختم ہونے سے پہلے برطانوی عام رائے نے سمجھ لیا۔ کہ وہ پہلے حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ کانفرنس میں اگرچہ اعتدال پسندوں کی اقلیت کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے مہاتما گاندھی کے مطالبے کو قریب قریب منظور کرایا۔ اور عارضی صُلح کا لازمی نتیجہ نکل آیا۔ دُوسری کانفرنس خواہ کامیاب ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان کے انتظام حکومت کے متعلق ہماری بلا واسطہ ذمہ واری کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ آخر کار ایک قوم نے اُس چیز کا مطالبہ کیا۔ جو خود داری کا تقاضا تھا۔ اگر ہم میں اپنی نسلی فضیلت کے احساس کو چھپانے کا سلیقہ ہوتا۔ تب بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ اگرچہ اُس صورت میں ہندوستان کی آزادی کا ارتقا نہایت خوش آئند

ہوتا۔ ہمارے متکبرانہ طرز عمل کی وجہ سے ہم نے ہر ایک ہندوستانی کو
یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کہ ہماری حکومت کی اطاعت کرنا
اس کے لئے موجب ذلت ہے۔ ہم نے اِس بنیادی نقص کے پیدا کرنے
میں بہت سے طریقوں سے مدد دی ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ نے سائمن کمیشن
کو نامزد کر کے اور مسٹر بالڈون نے یہ کہہ کر کہ ''خدا کے بھیجے ہوئے انگریز''
یہ بات قابل غور ہے۔ کہ ہندوستانی نوآبادیات کا لفظ تنہا استعمال نہیں کرتے
بلکہ ہمیشہ درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ جبل مرکب ہے ہندوستان
کی خوش قسمتی ہے۔ کہ مہاتما گاندھی اصطلاحات کی پروا نہیں کرتے۔ ان
کے نزدیک اصلی سوال اقتصادی ہے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ دیہات کا افلاس
دور نہ ہوگا۔ اور کاشتکاروں کی حالت نہیں سدھرے گی۔ جب تک کہ ہندوستان
کی گورنمنٹ ہندوستانیوں کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ مہاتما جی ہندوستان کے
آئینی مسائل کو بجٹ کے پیمانے سے جانچتے ہیں۔

ہندوستان سے میں یہ زبردست احساس لیکر جاتا ہوں۔ کہ دیہات
کے لئے خودداری اور شادمانی ایسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ جبکہ پولیس
اور چھوٹے سرکاری اہلکار ہندوستانیوں کی زیرنگرانی ہوں۔ دیہاتیوں کے
نزدیک جو صرف دھوتی اور لنگوٹی پہنتے ہیں۔ اور نہ انگریزی جانتے ہیں۔ نہ
تو ان گورنمنٹ سے کیا مراد ہے۔ وہ گورنمنٹ اسے سمجھتے ہیں جو بروقت
ضرورت ان کے کھیتوں کو پانی دے۔ میں نے پنجاب کی نہری نوآبادیوں
میں دیکھا۔ جہاں انجینئروں نے دشت پرخار کو گلزار سراپا بہار میں تبدیل
کر دیا ہے۔ کہ طویل القامت کسان اور ان کے موٹے تازے بیل نہروں
کی بدولت بڑی فصلیں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے

کہ جس پر حکومت خاص مہربان ہے۔ کیونکہ وہ فوج کے لئے آدمی اور
گھوڑے مہیا کرتا ہے۔ لیکن وہاں بھی دیوزاد سکھوں کو جن کے ہاتھوں
کے مقابلے میں میرے ہاتھ لڑکوں کے سے معلوم ہوتے تھے۔ پولیس کے
مظالم کا شاکی پایا۔ شہر کا پانی حکومت دے یا نہ دے۔ اس کا اختیار ہے۔ میسور
جیسا کہ بھی زمانہ قدیم سے مطلق العنانی کی مثال سی بر قدیم رہی ہے۔ جب میں
نے ان طویل القامت کسانوں سے سوال کیا۔ کہ آیا ان کے علاقے میں
کانگرس کا کچھ زیادہ اثر ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ اگر ہم کانگرس میں
شامل ہوتے۔ تو ہمارا پانی بند کر دیا جائیگا۔

ممکن ہے کہ ان کا یہ خوف صحیح نہ ہو۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ ایسا محسوس
کرتے تھے۔ بڑے شہروں میں روزانہ اخبارات نکلتے ہیں۔ پبلک جلسے ہوتے
ہیں۔ لیکن جب کوئی دیہات میں جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک
نہ بہ نسبت کی پولیس ہی گورنمنٹ ہے۔ اور وہ کوئی عظیم و وسیع طاقت نہیں
ہے۔ پولیس والوں کے پاس لاٹھیاں ہوتی ہیں۔ جسے وہ سختی سے استعمال
کرتے ہیں۔ انہیں رشوت بھی دینا پڑتی ہے۔ یہ ایسا الزام ہے جو ہندوستانی
افسروں اور پولیس مینوں کے خلاف ہر جگہ سننے میں آیا ہے۔ اسمبلی میں بھی اس
کا ذکر ہوتا ہے۔ عام لوگوں اور وکیلوں بلکہ غیر سرکاری انگریزوں کی زبانی بھی سنا
گیا ہے۔ ناظرین خیال کرینگے کہ یہ سوراج کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔
کیونکہ یہ پولیس والے ہندوستانی ہیں۔ بخلاف اس کے سیلف گورنمنٹ کے لئے
سب سے بڑی دلیل بھی یہی ہے۔ ہندوستان کی پولیس کو مغلوں کی روایات
ورثہ میں ملی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو باشندگان ہند کا نوکر خیال نہیں کرتے۔
اور جب تک وہ ہندوستانی حکام یا ہندوستانی وزیر کے سامنے وہ جوابدہ

نہ ہونگے۔ وہ ایسا خیال بھی نہیں کرینگے۔ آجکل تو وہ مطلق العنان حکام کے نوکر ہیں۔ اور اپ لیس کا کام یہ ہے۔ کہ لوگوں کو حکومت کی اطاعت کے لئے مرعوب کرے۔ انگریز افسر خواہ کیسے ہی ہوشیار ہوں۔ پولیس والوں کے خیال کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ خصوصاً آجکل کے زمانے میں کیونکہ انگریز کم ہیں۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ عدیم الفرصت و قت کا کام ان کا بہت کچھ وقت لے لیتا ہے۔ وہ بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کرنے نہیں جا سکتے کیونکہ وہ اپنے سفید رنگ کو نہیں چھپا سکتے۔ صحیح یا غلط طور پر کسانوں کا یہ یقین ہے۔ کہ پولیس کے خلاف شکایت کرنا بے سود ہے۔ اگر کسی پولیس افسر نے کسی کے ساتھ سختی کی ہو۔ تو مستقل ارادہ کا کوئی شخص ہائی کورٹ تک پہنچکر ممکن ہے۔ کہ مقدمہ جیت جائے۔ لیکن تب بھی یہ لازمی نہیں ہے۔ کہ اس قصوردار افسر کو سزا ملیگی۔ یا وہ موقوف کر دیا جائیگا۔ میں نے اس قسم کے مقدمات کی مثلیں فراہم کی ہیں۔ ہندوستان میں انگریز افسروں کی روایات یہ ہیں۔ کہ وہ دیانتدار ہوتے ہیں۔ اور اپنے فرض کو اچھی طرح بجا لاتے ہیں۔ لیکن جب میں ہندوستانی کسانوں کے مطمع نظر سے دیکھتا ہوں تو ان میں ایک ایسا نقص ہے۔ جو ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ انہیں اپنا دبدبہ اور شان برقرار رکھنے کا بڑا خیال ہے اور مطلق العنان حکومت اس مدت مدید کی روایت کو دور نہیں کر سکتی۔ وہ سرکاری افسروں کے قصور کو تسلیم کرنے کی جرأت نہیں رکھتی۔ اور ماتحت افسروں کی حد سے بڑھی ہوئی سرگرمی پر ملامت نہیں کرتی۔ وہ ہندوستانی افسروں کو اپنا وفادار رکھنا چاہتی ہے۔ اس لئے ان کے ساتھ وفادار رہنے پر مجبور ہے۔ جبکہ کھلی عدالت میں کسی پولیس افسر کو کسانوں پر سختی کرنے

کی بابت التماس کی گئی ہو۔ تب بھی گورنمنٹ کسی قابل اعتماد پولیس افسر کو برخواست نہیں کرتی۔ اور فطرت انسانی کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ ایسا ہونا خلاف توقع نہیں۔ ہندوستان میں انگریز افسر الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اول اس وجہ سے کہ وہ غیر سرکاری ہندوستانیوں سے معاشرتی زندگی میں بہت کم ملنے جلتے ہیں۔ دوسرے دفتر کے گھنٹوں میں وہ ہندوستانی ماتحتوں سے گھرا رہتے ہیں۔ جو اپنے مطلب سے انہیں گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

گول میز کانفرنس کی تجاویز

ان حالات کی موجودگی میں جب گول میز کانفرنس کی تجاویز کو دیکھتے ہیں۔ تو اُمید کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کے اندر آزاد ہندوستان اپنے مستقبل کو ڈھال سکتا ہے۔ اصولی طور پر صوبجات اور مرکز میں ذمہ دار گورنمنٹ منظور کی گئی ہے۔ ہندوستان اگر اس آئین کو منظور کر لے۔ اور اس پر عمل کرے۔ تو وہ نئی ہوا میں سانس لیگا۔ آخرکار پانچ نسلوں کے بعد ہندوستانیوں کی گورنمنٹ پھر دہلی میں حکومت کریگی۔ اور آزادی اور شان کو ہر ایک ہندوستانی محسوس کرے گا۔ نسلی ذلت کا داغ دُھل گیا ہے۔ ایک قوم کی مرضی کا فالج دُور ہو گیا اس آئین کی رُو سے ہندوستان اپنی روزانہ زندگی میں تبدیلی پیدا کریگا۔ آئندہ وہ یہ محسوس نہیں کریگا کہ اس کی تقدیر بدیشیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں وہ مثالیں دیکھی ہیں۔ کہ ذلت کی مُہر توڑ جانے

سے انسانوں کی دماغی حالت کس قدر ترقی کرسکتی ہے۔ اول تو ہمارے ملک کی عورتوں نے آزادی حاصل کرکے بہت کچھ ترقی کی ہے۔ دوسرے روس کی ذلت جماعت نے اپنا مستقبل بنا لیا ہے۔ خدا کرے۔ کہ ہم ہندوستان میں بھی ایسا دیکھیں۔ کہ اُس کے باشندے ایسا محسوس کریں۔ کہ وہ تن کے کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اور اُن کی تعمیر کُن طاقتیں آزاد ہوجائیں۔ جو دروازے اُن کے لئے بند تھے۔ وہ کھل جائینگے۔ جو ہندوستان فاتحان کے قبضے میں تھا۔ اُس کو ہندوستانی اپنی کوششوں سے اپنے خیال کے مطابق ڈھالیں گے۔ جو قوم آزاد ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی کوششوں سے ترقی کرتی ہے۔ اُسے نئے لیڈر مل جاتے ہیں۔ اُس کی ہمتیں وسیع ہوجاتی ہیں۔ جو کامیابی برسوں میں ہوتی ہے۔ وہ ایک رات میں حاصل کرلیتی ہے۔ جدو جہد کے سال میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ اور دورِ جدید سے پہلے دس سال میں ایسا ہوتا رہنا چاہئے۔ ہندوستان کے متعلق میرا علم قلیل ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں میں آزاد شدہ لوگوں کو میں نے کام کرتے دیکھا۔

اِس مسودے کے منظور ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ مالی معاملات کے متعلق ہے۔ ہندوستانی یہ کہتے ہیں۔ کہ جب ہمیں مرکز میں ذمہ داری دی جاتی ہے۔ تو ملکی اخراجات کے ۸۰ فیصدی حصّہ کو ہمارے اختیار سے کیوں خارج کیا جاتا ہے۔ پہلے فوج کو لیجئے۔ جس پر کل اخراجات کا ۲۶ فی صدی سے لے کر ۳۲ فیصدی تک خرچ ہوتا ہے۔ اُس کے بعد قرضے ہیں اور سول انتظام کا خرچ ہے۔ جب یہ تمام اخراجات محفوظ کر لئے جائیں۔ تو قوم کے تعمیری کاموں کے لئے بہت تھوڑی رقم باقی رہ جاتی ہے تعلیم اور حفظانِ صحت اور ترقی زراعت وصنعت کے واسطے ۱۹ فیصدی

سے زیادہ روپیہ نہیں بچتا۔ ہمیں کانگرس کی دلیلوں کو کشادہ دلی سے سُننا چاہیئے۔ جو کہتی ہے۔ کہ بعض قرضوں کی رقمیں ہندوستان کے سر نہیں منڈھنی چاہئیں۔ کفایت شعاری کے لیئے سب سے زیادہ پُر از اُمید میدان فوجی اخراجات کا ہے۔ اس کی بابت تین امکانات ہیں۔ اول یہ کہ تخفیف اسلحہ کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ ماہران کا خیال ہے۔ کہ فوجی اخراجات میں ۲۵ فیصدی کی کمی ہو جائیگی۔ اگر ایسا ہؤا۔ تو ہندوستان کو بھی فائدہ پہنچیگا۔ دُوسری بات یہ کہ جس پیمانے پر ہندوستان میں فوج رکھی ہوئی ہے۔ وہ چند اندیشوں کی وجہ سے قایم کیا گیا تھا۔ اور اب وہ خوف باقی نہیں رہا۔ اور اگر ہندوستان کی فوج تمام مشرق کے لئے ہے۔ مثلاً چین یا رُوس کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تو سائمن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق برطانیہ کو اس خرچ کا حِصّہ اپنے ذمہ لینا چاہیئے۔ لیکن یہ فوج زیادہ تر مختلف قسم کے اندرونی خدشات مثلاً فرقہ دارانہ فسادات اور یورپین چھاؤنیوں پر حملے کے خطرات کو روکنے کی غرض سے ہے۔ اگر یہ خطرے کم نہ ہو جائیں۔ تو سیلف گورنمنٹ دینا بالکل بے معنی ہے۔ مقامی فسادات کے متعلق احتیاط ابھی تک ضروری ہے۔ لیکن یہ قدیم خوف کہ لوگ بدیشی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور ہندوستانی رجمنٹیں بھی اُن کیساتھ شامل ہوجائینگی۔ معقول نہیں ہے۔ بشرطیکہ دیانتداری کے ساتھ ہماری یہ نیت ہو۔ کہ آئندہ ہندوستان خود اپنے آپ پر حکومت کرے۔ ۵ سال کے لئے فوجی اخراجات فوراً کم کر دینے چاہئیں۔ اور اس کے بعد دیکھنا چاہیئے۔ کہ اِس قدر فوج کافی ہے یا نہیں۔ مالی مسئلے کے بعد فیڈرل سکیم قابل غور ہے۔ درا صل برطانوی ہند اور ریاستوں کی رعایا کے درمیان نسل

زبان۔ مذہب اور تمدن کا کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ اتحاد بھاری قیمت پر خرید کیا ہے۔ والیان ریاست نے اپنا کوئی حق ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور فیڈرل سکیم میں انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اور خود کچھ نہیں دیا۔ اب وہ ہندوستان کے معاملات میں دخل دے سکیں گے۔ جہاں تک کہ محاصل اور وسایل آمدورفت کا تعلق ہے۔ اس فیڈریشن کے اندر والیان ریاست مطلق العنان رہینگے یعنی انہیں اپنی رعایا کی جان و مال اور عزت اور جائیداد اور تحریر و تقریر کی آزادی پر بدستور اختیار حاصل رہیگا۔

اس مسودے میں کوئی ایسی تجویز نہیں ہے جس کی رو سے فیڈرل کونسلوں میں نیابت کا یکساں طریقہ ہو۔ برطانوی ہند کے صوبے اپنے نمائندے منتخب کرینگے۔ لیکن والیان ریاست جیسا ان کے دل میں آئے عمل کرینگے۔ بعض ریاستوں میں کونسل بائے مشورت قایم ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ انتخاب کا کوئی طریق جاری کریں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی مرضی سے ممبر نامزد کرینگے۔ قصہ مختصر یہ کہ والیان ریاست اپنے ملازموں کو کونسلوں میں بھیجینگے۔ جہاں وہ ان کی مرضی کے مطابق ووٹ دینگے۔ جب تک والیان ریاست مطلق العنان ہیں اس وقت تک ان کی رعایا کے مفاد اور عام رائے کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔

اگر والیان ریاست سچ مچ خود مختار ہوتے۔ تو یہ نہایت قابل اعتراض بات ہوتی۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں۔ جنہیں تقریباً خود مختار کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ریاست میسور کا انتظام نہایت عمدہ ہے۔ اور اس کی رعایا بالکل فارغ ہے۔ لہذا یہیں سے دست اندازی کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آتا۔ دوسری ریاستوں کی حالت بگڑ گئی ہے۔ عام طور پر ان کا انتظام حکومت بہت نکما ہے وہ ریاست کی آمدنی کو ذاتی شان و شکوہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ

اپنی رعایا پر اس قدر ظلم کرتے ہیں۔ کہ ان کا ریذیڈنٹ یا دہلی کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کسی وقت دخل دینے کے لیئے کافی وجوہات رکھتا ہے۔ عملی طور پر نگرانی کے اس اختیار کا کمتر استعمال کیا جاتا ہے۔ والیان ریاست کے مظالم اور ان کے عیش وعشرت پر بڑی حد تک چشم پوشی کیجاتی ہے لیکن ان کا سلطنت کا وفادار رہنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جب کسی والئی ریاست کی بہت سی بدعنوانیوں کی وجہ سے گورنمنٹ ناراض ہوتی ہے۔ تو اسے گدی سے اتار دیا جاتا ہے۔ اس لئے والیان ریاست اپنی سیاسی کارروائیوں میں گورنمنٹ کے منشا کے خلاف عمل نہیں کرتے۔ اور اس کے ایماء پر چلتے ہیں۔ اس امر کو سب لوگ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فیڈرل کونسلوں میں والیان ریاست کی بہت بڑی نیابت یعنی تمام ممبروں کی ایک ایک تہائی کی تجویز جب گول میز کانفرنس میں پیش ہوئی۔ تو تمام کنسرویٹو ممبران اور سرکاری ممبران فیڈرل تعلیم کی تائید کی۔ برطانوی ہند کی ذمہ دار مرکزی گورنمنٹ کے لئے کنسرویٹو نمائندگان کی تائید حاصل کرنا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ کیونکہ بغیر اس صورت میں انتظامی حکومت کی نگرانی منتخب شدہ اسمبلی کے ہاتھ میں آجاتی۔ لیکن اب والیان ریاست اس کی حریت میں اڑچن ڈالینگے اور جو فرض آج کل سرکاری ممبر ادا کرتے ہیں۔ وہ والیان ریاست ادا کیا کرینگے ان کے سخت سے سخت نکتہ چین بھی انہیں آزاد خیالی کا میلان رکھنے کا الزام نہیں لگائینگے۔ اور ہر شخص آسانی سے فرض کر سکتا ہے۔ کہ جب وائسرائے گورنمنٹ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے کسی معاملے کے خلاف ہوگا۔ تو ریاستوں کے نمائندے اس کی تائید کرینگے۔ بس ہندوستان کو ایسی کمل آزادی نہیں دی جارہی ہے۔ جیسی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے

فیڈرل اسمبلی ایک ہندوستانی مجلس دکھائی دیگی۔ لیکن اُس کے اندر بادشاہ کے آدمی" موجود رہینگے۔ جو ہندوستانیوں کی مرضی نہ چلنے دینگے۔ والیان ریاست کو اسمبلی یا کونسل آف سٹیٹ میں اکثریت تو حاصل نہ ہوگی۔ لیکن برطانوی ہند کے کنسرویٹو حلقوں سے نمائندے ہمیشہ ان کے ساتھ رہینگے۔ اور اس طور پر فیڈرل کونسلوں میں کنسرویٹو کی اکثریت رہیگی۔ ایک الیکشن کے بعد دوسرا الیکشن ہوگا۔ لیکن جب تک برطانوی ہند عملی طور پر متفق الخیال نہ ہو آزاد خیال لوگوں کی اکثریت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ریاستوں کے نمائندے شاید اُن معاملات پر ووٹ دینے سے باز رہا کریں۔ جن کا تعلق محض برطانوی ہند سے ہے۔ مثلاً وہ کسی ایسی تجویز کی براہ راست مخالفت نہ کریں۔ جو زمینداروں کی آمدنی پر انکم ٹیکس لگا کر کاشتکاروں کا بوجھ کم کرنے کے متعلق ہو۔ لیکن وہ کسی ایسی گورنمنٹ کو برسرِ حکومت آنے سے روک سکتے ہیں۔ جو اس طور سے زمینداروں کو ناراض کرنا چاہے۔ یہ بھی تجویز ہے۔ کہ کسی وزارت کو عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرکے برخواست کرنے کے لئے دو تہائی ووٹوں کی اکثریت ہونی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ کسی وزارت کے برقرار رہنے کے لئے ریاستی نمائندوں کی حمائت لازمی ہوگی۔ باشندگان ہند اور والیانِ ریاست کی رعایا کا مطالبہ یہ ہے۔ کہ جو اختیارات اِس وقت برطانیہ کو حاصل ہیں آئندہ انہیں فیڈرل گورنمنٹ عمل میں لائے۔ یعنی فیڈرل وزراء کے مشورے کے مطابق وائسرائے عمل کیا کریں۔ اگر ایسا ہو۔ تو امپیریل طاقت کے حمائتی ہندوستانی پارلیمنٹ میں کچھ خلل نہ ڈال سکینگے۔ اغلب ہے کہ برطانیہ اس معاملے میں جھک جائے۔ اُس نے ہندوستانیوں کو اپنی مرضی کے مطابق قوانین وضع کرنے سے روکنے کا کام والیان ریاست سے

لینا چاہا ہے۔ مگر ایک اور بھی امکان ہے۔ جو اس خطرے کو کم کر دیگا۔ ایک تجویز یہ ہے۔ کہ وائسرائے اگر وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کرے۔ اور اعلیٰ اختیار اُسے ذاتی طور پر دیدیئے جائیں۔ تو ایک سپریم کورٹ قایم ہونی چاہیئے۔ کہ اگر اختلاف رائے پیدا ہو۔ تو معاملہ عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔ اگر آئین میں باشندگان ملک سے حقوق کا اعلان کیا جائے۔ تو سپریم کورٹ نہایت اہم خدمت سرانجام دیگی۔ اور وہ زیادہ مطلق العنان والیان ریاست کو اپنی رعایا کو ابتدائی حقوق دینے پر مائل کر سکیگی۔

اگر باشندگان ہند آئین میں عام باشندوں کے حقوق کا اعلان درج کرائیں۔ تو والیان ریاست کیساتھ اُن کے تعلقات درست رہینگے۔ اس کے بعد والیان ریاست آزاد ہوں گے۔ کہ وہ فیڈریشن میں داخل ہوں یا نہ ہوں اگر وہ داخل ہوں۔ تو انہیں اپنی رعایا کو مہذب باشندوں کے لیئے کم از کم حقوق دینے ہونگے۔ جو والیان ریاست فیڈریشن میں داخل نہیں ہونگے اُن کی رعایا اُن کے خلاف بہت جلد ایجیٹیشن کرنے لگیگی۔ اور تمام ہندوستان کی ہمدردی اس کے ساتھ ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی شرائط پر داخل ہونا چاہیں۔ اور بدستور اپنی رعایا کے جان و مال کے مالک بنے رہیں۔ تو اعلیٰ حکومت اور فیڈریشن کے لئے لازمی ہوگا۔ کہ اُن کی حفاظت کریں۔ اور ان کی رعایا کی ایجی ٹیشن سے انہیں محفوظ رکھیں۔

صوبجات کا آئندہ انتظام حکومت

صوبجات کے آئندہ انتظام حکومت کو دیکھ کر تشفی ہوتی ہے۔

مرکزی انتظام کے لئے جو پیچیدگیاں تجویز کی گئی ہیں۔ وہ صوبوں میں نہیں ہیں۔ وہاں کوئی صیغہ محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اور نہ والیانِ ریاست کو حرّیت کی تباہی کے لئے داخل کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کے خیال میں صوبوں کا انتظام مرکزی انتظام کے برابر اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ باشندگان ہند کے اتحاد کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ اعلیٰ حکومت دہلی میں رہتی ہے۔ نہ کہ مدراس یا لاہور میں۔ تاہم لوگوں کی روزانہ زندگی کا تعلق صوبوں کی گورنمنٹ سے ہے۔ وہ تمام زراعتی مسائل کا فیصلہ کریگی۔ وہ لگان اراضی کا تعین کریگی۔ اور زراعتی اور دیہاتی صنعتوں کو ترقی دے کر ہندوستان کے افلاس کی بیخ کنی کریگی۔ تعلیم پھیلا کر لوگوں کے خیالات بدلیگی۔ جنگلات اور آبپاشی اور حفظانِ صحت اور مزدوروں کے متعلق آئین سازی بہ سب اسکے اختیار میں ہوگی۔ اور سب سے آخر میں یہ کہ ہندوستان وزیر کے سوا کوئی شخص پولیس کو یہ تعلیم نہیں دے سکتا۔ کہ وہ اپنے آپ کو عوام کا خادم خیال کرے۔ مرکز کی بجائے مجلسی آئین سازی اور اقتصادی ترقی کی صوبوں میں زیادہ اُمید ہے۔ لیکن مسودے میں وہی عوام کی نمائندگی کا خوف ظاہر کیا گیا ہے۔ فرنچائیز سب کمیٹی کے ۲۵ ممبروں میں سے صرف ۲ ہندوستانیوں نے یہ رائے دی۔ کہ تمام بالغان کو فوراً ہی حق رائے دہندگی دیا جانا قابل عمل ہے۔ باقی ممبران کی یہ رائے ہے۔ کہ تمام آبادی کے ۱۰ فیصدی حصے اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ فی صدی حصے کو حق رائے دہندگی دیا جائے۔ اور ووٹروں کے لئے یہ شرط رکھی ہے۔ کہ وہ فلاں حد تک آمدنی رکھتے ہوں اور تعلیم یافتہ لوگوں اور اُن کو جنہوں نے فوج میں خدمات سرانجام دی ہیں یہ حق دیا گیا ہے۔ اِن سفارشات کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ ان کی رو سے

تمام صاحب جائیداد اور تعلیم یافتہ جماعتوں کو ووٹ کا حق ملیگا۔ جن میں کلرک اور دکاندار بھی شامل ہیں۔ اور دیہات میں خوشحال مالکان اراضی اور شہروں میں کاریگروں۔ فورمینوں۔ اور ہنرمند دستکاروں کو۔ غریب مزارعان اور مزدور محروم رہینگے۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ صرف نصف بالغ مردوں کو ووٹ کا حق حاصل ہوگا۔

غریبوں کے لیئے بھی ایک تجویز ہے۔ ان کو بیس بیس کی ٹولیوں میں شامل کیا جائیگا۔ جو ایک ووٹر منتخب کرینگے۔ اور وہ آگے انتخاب میں حصّہ لینگے۔ یعنی کہ ایک مزدور یا مزارعہ کو ایک سُودخوار یا زمیندار کے مقابلے میں بیسواں حصّہ حق حاصل ہوگا۔ غرضیکہ جہالت کے مقابلے میں افلاس کو زیادہ اہمیت دیگئی ہے۔ مگر اس میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ ... دیہاتی بالکل بیخبر نہیں ہیں۔ وہ مباحثے کی عادت رکھتے ہیں۔ وہ شام کے وقت سایۂ دار درخت کے نیچے باہم گفتگو کرتے ہیں۔ بعض وقت سیاسیات پر بھی بحث ہوتی ہے۔ گاؤں کا خواندہ آدمی ہفتے وار ورنیکلر اخبار شروع سے آخر تک بآواز بلند پڑھ کر سُناتا ہے۔ میں ایک گاؤں میں پہنچا۔ جہاں ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار کے لیڈنگ آرٹیکل یکے بعد دیگرے پڑھ کر سنائے جارہے تھے۔ اُس گاؤں کے باشندوں میں چنداں اختلاف رائے نہ تھا۔ کیونکہ ہر شخص غریب ہے۔ ہر شخص مقروض ہے۔ اور ہر شخص سُودخوار اور زمیندار سے بیزار ہے۔ سارا گاؤں تکلیف میں ہے۔ اور اس کے خیالات مُتحد ہیں۔

صوبجات مُتحدہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں ۲۰۰ آدمیوں کی آبادی تھی۔ صرف تین شخصوں کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ میری

اُن سے بات چیت ہوئی۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ کامیاب امیدوار نے جو
اِلیکشن کا ممبر بنا ہے۔ ہمیں دھوکا دیا۔ وہ کھدر پہنتا تھا۔ اور اپنی موٹر پر
کانگریس کا جھنڈا لگا رکھا تھا۔ یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہُوا۔ کہ کانگریس نے الیکشن
کا بائیکاٹ کیا ہُوا ہے۔ لیکن اگر ہمیں بروقت خبر بھی ہوجاتی۔ تب بھی کچھ
فرق نہ پڑتا۔ ہمیں اُسے ووٹ دینا ہی پڑتا۔ کیونکہ وہ ہمارا زمیندار ہے اُنکی مشکل کو۔
سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے۔ کہ ان دیہات کی آبادی کیسی مجبوری کی حالت میں ہے
اور کوئی زمیندار یا اُس کے گماشتے کیسی آسانی سے ان کیساتھ دھوکا کر سکتے ہیں
اگر اُس سارے گاؤں کو ووٹ کا حق حاصل ہوتا۔ تو وہ کسانوں کے اُمیدوار کو
ووٹ دیتے۔ کمیٹی کی جو تجویز ہے۔ کہ سارے گاؤں کی طرف سے دو تین آدمی ووٹ
دیا کریں۔ تو تب بھی ایسا ہُوا کریگا۔ جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔ زمیندار اور اس کے گماشتے
ان پر نظر رکھینگے۔ یہ بیچارے مقروض ہیں۔ اور خوف زدہ ہیں مبادا ان کی
اراضی چھن جائے۔ مالیہ کا ایک ایک پیسہ ادا کرتے ہیں پھر بھی اپنی رسیدیں نہیں ملتی
پس لازمی طور پر وہ زمیندار کے لئے یا جس شخص کی وہ سفارش کرے یا
ووٹ دینے کے لئے مجبور ہیں۔ سارے گاؤں کو کوئی شخص بیدخل نہیں کرا سکتا
البتہ تین آدمیوں کو آسانی سے بیدخل کرایا جا سکتا ہے۔ یا بیدخلی کا خوف دلایا جا
سکتا ہے۔ ان غریبوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے اگر دھمکی کارگر نہ ہو۔ تو پھر رشوت
سے کام لیا جاتا ہے سارے گاؤں کو رشوت دینا تو مشکل ہے لیکن ایک اوسط
درجہ کا متمول زمیندار تین میں سے ایک مزارعہ کو ضرور رشوت دے سکتا ہے۔
ہندوستانی عوام کو اُن کے لوٹنے کھسوٹنے والوں کے سیاسی جوئے
میں جوتے رکھنے کی تجاویز میں سے سب سے بدتر تجویز بالواسطہ انتخاب
کی ہے۔

فرقہ دارانہ نفاق

ذمہ وار گورنمنٹ یا کسی قسم کی نمائندہ گورنمنٹ ہندوستان میں قائم کرنے کے لئے جو ضروری لوازمات ہیں ہندوستان میں ابھی تک ان کی کمی ہے۔ دو مذہبی جماعتوں کے درمیان جو نفاق چلا آتا ہے۔ اس کو دُور کرنا باقی ہے۔ اگر مسلمان یا ان کا بڑا یا اثر حصہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کرانے میں کامیاب ہو گئے تو اکثر صوبوں میں سیاسیات کو تعمیری طور پر کام میں لانا مشکل ہو گا جداگانہ نیابت کے نتائج اس قدر عیاں ہیں کہ اکثر اہل قلم نے آج تک ان کی حمایت نہیں کی۔ جب تک ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ گلوں میں تقسیم ہیں اسوقت تک ہر ایک امیدوار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ میں اپنے مذہب کی زبردست حفاظت کرنے والا ہوں۔ ایک مقابلہ شروع ہو گیا کہ کونسا امیدوار اور کونسی جماعت دین کی زیادہ حفاظت کرنے والی ہے۔ دونوں مذہبوں کے اعتدال پسند اور آزاد خیال لوگ جن کا مطمع نظر دقیانوسی نہیں ہے یا وہ ناکام رہے یا انہیں ایسا جوش خروش ظاہر کرنا پڑا جو در اصل ان کے دل میں موجود نہ تھا۔ یہ طریقہ انتخاب دونوں جماعتوں کو علیحدہ رکھتا ہے اور مل جل کر کاروائی کرنے کی عادت پیدا نہیں ہونے دیتا سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اقتصادی مفاد کی بنیاد پر جماعتوں کو تقسیم نہیں ہونے دیتا جب تک یہ طریقہ قائم ہے کوئی قطعی مجلسی پروگرام نہیں بن سکتا۔

ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا نتیجہ تحمل اور اعتدال کو معدوم بنا ٹھہرا ہے ایک ہندو امیدوار جو چند مسلمان ووٹ بھی حاصل کرے گا اپنے ہم مذہبوں سے یہ کہنے

کی ضرورت نہ رکھے گا - کہ گویں خطرے میں ہیں - بلکہ بخلاف اس کے وہ لگان اراضی اور سود خواری اور کاشت کاروں کے لئے اچھے مکانات تعمیر کرنے کے معاملات پر گفتگو کریگا - ہندو اکثریت معاملت کے لئے جو تجویز پیش کرتی ہے وہ اقلیتوں کے لئے کافی نیابت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے - جو تجویز کہ کامیابی کے ساتھ آزمائی جاچکی ہے وہ یہ ہے - کہ اقلیت جماعت کے لئے اس کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ رکھی جائیں - اگر مسلمان آبادی کا تیسرا حصہ ہیں اور سو نشستیں پُر کرنی ہیں تو ۳۳ مسلمان منتخب ہونے چاہیں اس سے کم نہ ہوں - خواہ زیادہ مقرر ہوجائیں یہ درست ہے کہ ہندو ووٹ مسلمان امیدواروں کو ملینگی - مگر اس طرح ہندوؤں کو مسلمانوں کی ووٹیں حاصل ہونگی جب ایک مذہب کے امیدوار دوسرے مذہب والوں سے ووٹوں سے بھی منتخب ہونگے تو پھر کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا جو کسی مذہب کیلئے ناگوار ہو نشستوں کا مخصوص کرنا اگرچہ کچھ بہت اعلیٰ انتظام نہیں ہے - لیکن اقلیت کو اس سے اطمینان ہوجائے گا - یہ جھگڑا دیر سے چلا آتا ہے کہ ہر ایک صوبے میں کسی جماعت میں اس کی آبادی کے تناسب سے ہوسکتا ہے یا کہ اس کے ووٹروں کے تناسب سے میں اس جھگڑے میں نہیں پڑوں گا - نہ اس مسئلہ پر بحث کرونگا ایک اقلیت جماعت کو اس کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دیجائیں - لوگ ان تفصیلات پر اس غرض سے جھگڑتے ہیں - کہ وہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتے اگر مسلمان علیحدگانہ نیابت کا مطالبہ ترک دیں تو ہندو تمام تفصیلات میں ان کے ساتھ معقول برتاؤ کرنے کو تیار ہونگے - جب تک اس نفاق کو دور نہ کیا جائیگا ہندوستان ایک قوم نہ بن سکے گا - اور جب تک یہ رکاوٹ اسکی راہ سے دور نہ ہو وہ سیلف گورنمنٹ سے خواہ وہ کتنی ہی فیاضانہ مقدار میں دیجائے

... مجلس عوامت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں یقینی طور پر
... انہوں نے رویہ اختیار کر کے برطانوی گورنمنٹ
... رائے ظاہر نہیں کرنی پڑے گی کیونکہ
... تو وہ تصفیہ کرنے میں کبھی لیت و پیش
... جو برطانوی فائدے کی بات
... ہندوؤں کے ساتھ شمار کر لیا جائے
... شریعت مشترکہ نمایندگی حامی ہے
... کانگریس کے مسلمان ممبروں کی
... سیاسی پارٹیوں کی تعداد

... کیا ہے

... کو شروع کیا ... اور اقتصادیات
... حیثیت سے آئے۔ بعض دفعہ انہوں
... کرتے ہیں ...
... شامل ہوتی رہی ہیں ...
... ذلت سے نکلنے کے ...
... آج کل اچھوت لوگ عیسائی بن
... مسلمان ہو گئے تھے عیسائی ہی
... عیسائیوں میں رنگت کا تعصب

پایا جاتا ہے۔ بہرحال مغل شہنشاہوں کے عہد میں دونوں جماعتوں کے مابین
بہت کچھ تلخی دُور ہو گئی تھی۔ مسلمانوں میں ہندو مذہب کے خلاف ایک قسم
کی نفرت پائی جاتی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ ہندو دھرم نے ہر قسم کے عقائد
کو اپنے میں جذب کر لیا ہے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ اس نفاق کی زیادہ
تر وجہ مذہب نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمان جن کی اکثریت ہندوؤں سے
مسلمان ہوئی ہے۔ وہ اپنے قدیم رواجات پر قائم ہیں۔ بلکہ ذات پات کو
بھی مانتے ہیں۔ بڈھے آدمیوں نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ ہماری جوانی کے
دنوں میں بڑے بڑے تہواروں پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی عبادت
گاہوں میں رواداری اور تقدس کے اظہار کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ اور اب
بھی بعض علاقوں میں یہ دستور موجود ہے۔ بعض ہندوستانی ریاستوں میں
جو مذہبی تنازع پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بہت تھوڑے دن سے پیدا ہوئے ہیں
علاوہ ازیں مسلمانوں کے غصے اور ہندوؤں کے خوف کی کوئی معقول وجہ
ضرور موجود ہو گی۔ شرع اسلام میں سُود لینا ممنوع ہے۔ اکثر ہندوستانی مسلمان
اس پر عمل کرتے ہیں (اگرچہ پٹھانوں کو اس کی پروا نہیں ہے) اور اس کا نتیجہ
یہ ہے کہ ہندو قرض دیگر مسلمانوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جس طرح ارمنی
سُود خوار ترکوں کو لوٹتے کھسوٹتے تھے۔ جہاں کہیں ہندو سُود خوار
مہاجن گاؤں کی فصل کچی بیچتا اور فروخت کرتا ہے۔ وہاں ہندوؤں کے
خلاف جذبہ ناراضی کا بڑھنا لازمی ہے۔ نیز گئوہتیا کر کے ہندوؤں کا
دل دُکھاتے ہیں بعض مسلمان خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جب ہندو زیادتی
کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ان کی گفتگو میں قدرے بیزاری پائی
جاتی ہے۔ لیکن اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندو [illegible]

مذاہب کے ساتھ بے حد رواداری برتتے ہیں۔ ان کی نکتہ چینی کا خلاصہ یہ ہے
کہ مسلمانوں کے دماغ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ ان کے اوضاع و اطوار کم شائستہ
ہیں۔ اور عورتوں کے متعلق ان کا رویہ ناپسندیدہ ہے۔ ہندوؤں کے جلوس
مسجدوں کے قریب سے باجہ بجاتے ہوئے گذرتے ہیں۔ شاید عمداً اس نیت
سے کہ مسلمانوں کی نماز میں خلل پڑے۔ یا اتفاقی طور پر یا نماز میں جھگڑا ہو جاتا
ہے۔ اور بلوہ بلکہ قتل و خونریزی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ جیسا کہ سال
گذشتہ میں دکن میں واقعہ گذرا تھا۔ کہ مسلمان دیہاتیوں نے ہندو
قصبے کو لوٹ لیا تھا۔ اس امر کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ کہ اس قسم کے
بلووں کے لئے بعض دفعہ پہلے سے تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اور شک کیا
جاتا ہے۔ کہ بلوہ کرنے میں لیڈروں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔

کچھ عرصے سے برطانوی ہند میں تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے
مابین ایک اور رقابت شروع ہو گئی ہے۔ ہندو اعلیٰ دماغی قابلیت رکھتے
ہیں۔ اور عام طور پر متمول ہیں۔ انہوں نے مغربی تعلیم پہلے حاصل کی۔ اور
سرکاری ملازمتوں اور تعلیم گاہوں میں جو آسامیاں مقابلہ سے پُر کی جاتی ہیں
ان کی اکثریت رہی۔ کچھ عرصے سے مسلمانوں نے اپنی تعدادی کمی [illegible] شروع کی۔
اور وہ اس کے لئے مسلسل کوشش کرتے۔ چاہتے ہیں کہ ان کی آبادی
کے تناسب سے سرکاری ملازمتیں ان کے ہم مذہب لوگوں کو ملیں۔
یہ مطالبہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کہ فلاں یونیورسٹی میں
ایک تہائی یا نصف پروفیسروں کی اسامیاں مسلمانوں کے لئے محفوظ
رکھی جائیں۔ بعض ٹیکنیکل کالجوں میں مسلمان طلباء کے لئے ایک تہائی
نشستیں محفوظ کی جاتی ہیں۔ اور جن ہندو طلباء نے امتحان انٹرینس اعلیٰ نمبروں سے

پاس کیا ہو نہیں داخل کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ احاطہ بمبئی میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ وہ مرزی سرحدوں کی ایک تہائی تعداد مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والی ہونی چاہئیے۔ اس رقیبانہ مقابلے کی وجہ سے نوجوانوں کی زندگی شروع سے ہی زہر آلودہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو شخص مذہب کی بدولت نوکری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کثیر آبادی کے ملک میں عمر بھر بیکار رہتا ہے۔ غرضیکہ مذہب نے ایک نئی اقتصادی قیمت حاصل کر لی ہے۔ اور ہندوستان میں اگرچہ مذہبی عقاید کمزور ہو رہے ہیں لیکن وہ اپنے زوال پذیر عقاید کی گوناگون کی لعنت میں مبتلا ہے۔

ایسی سوسائیٹی میں جس نے زراعت اور صنعت کو ترقی دینے پر کم توجہ کی ہے۔ اور جہاں اقتصادی حالت اس قسم کی ہو۔ وہاں جداگانہ نیابت کا نتیجہ بخوبی سمجھ آسکتا ہے۔ وہ ملازمتوں اور عہدوں کے حصول کا ذریعہ خیال کی جاتی ہے۔ کانگرس کو چھوڑ کر باقی تمام پارٹیاں لوٹ کا مال تقسیم کرنے کے فکر میں ہیں۔ ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے ہوشیار نوکر شاہی نے فایدہ اٹھانے کا سبق حاصل کیا ہے۔ اور صوبوں کی کونسلوں میں عہدے اور منصب عطا کر کے وہ اکثریت قایم کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں بدیشی حکام پر تکیہ رکھنے کا نتیجہ ہے جس نے حال کے چند برسوں میں دونوں جماعتوں کو علیحدہ رکھنے کی بہت کچھ کوشش کی ہے۔ میں باور کرتا ہوں۔ کہ ایسا کہنا ایک اتہام ہے۔ جو ہندوستان عموماً لگایا کرتے ہیں۔ کہ نوکر شاہی دونوں جماعتوں کے مابین جان بوجھ کر تنازعہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی روایات اس سے بالاتر ہیں۔ لیکن وہ ان فوائد سے باخبر ہے۔ جو ان کے

نفاق کیسے اُس کو پہنچتے ہیں۔ انگلینڈ کے کنسرویٹو اخبارات جُداگانہ نیابت کے قایم رکھنے پر حد سے زیادہ مُصر ہیں۔ یہ اس خواہش کا ثبوت ہے۔ ایک انگریز حاکم جس کے ماتحت اور جس کے اردگرد بہت سے ہندوستانی ہوتے ہیں۔ وہ ہرگز کسی غیر مناسب خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اُس کے دماغ میں یہ خیال ہو۔ کہ ہندو مسلمانوں کے نفاق کی وجہ سے اُسے حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ تو محکوم رعایا کا ذی حس طبقہ اِس خیال کو محسوس کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اِس نفاق نے ہندوستان کی آزادی کو کئی سال پیچھے ڈال دیا ہے۔ آزاد ہندوستان کو جن خطرات کا سامنا ہوگا۔ یہ نفاق اُن سب میں بدترین خطرہ ہے۔ میں نے مسلمانوں کو کھلم کھلا یہ گفتگو کرتے سنا ہے۔ کہ پنجاب میں جب سیلف گورنمنٹ قایم ہوگئی۔ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ اُسکے دو دروازے بن گئے۔ تو وہ بڑی آسانی سے ہندوستان کو ایک دفعہ پھر فتح کر لیں گے۔ یہ ناوانوں کی سی شیخی ہے۔ مغل تو انہیں یاد رہے ہے۔ لیکن وہ مرہٹوں کو بھول گئے۔ سکھوں کی سی جنگی طاقت جب ہندوؤں کیساتھ ہو۔ تو دونوں پلڑے برابر ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ فرض کر لیا جائے۔ جیسا کہ ہمارے جنرل اکثر کہا کرتے ہیں۔ کہ ہندوؤں کی جنگی طاقت اُن کی نام نہاد جنگجو ذاتوں تک محدود ہے۔ دراصل آہستہ آہستہ مگر نمایاں طور پر تبدیلی ہو رہی ہے۔ اور ہندو اگرچہ کئی نسلوں سے عمداً کمزور ہو گئے ہیں لیکن ان کی نوجوان نسلیں جنگی طاقتیں حاصل کر رہی ہیں۔ جنکو مہاتما گاندھی کے اثر نے کسی قدر روک دیا ہے۔ بہت خود ضبطی سے حاصل ہوتی ہے

یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں۔ کہ سکھ [illegible]
تھے۔ انہوں نے کوشش سے اپنے تئیں [illegible]
طور پر یہ خیال ہے۔ کہ مسلمان ہندوستان پر [illegible]
لیکن مجھے اس میں کلام ہے۔ [illegible] ہندوستان [illegible]
پر اثر پڑتا ہے۔ جس قدر ہندوستان [illegible]
ہوگی۔ اسی قدر یہ خطرات [illegible]
کو نیا ہندوستان بنانے کا کام [illegible]
اور اپنی اپنی جماعت کے [illegible]
آجائیں گے۔ [illegible] اپنی [illegible] جماعت [illegible]
اور مجلسی حالات کے بدلنے [illegible] تو ان کی آنکھیں کھل
جائیں گی۔ جب ہندوستان کی عقل [illegible] ترقی دینے
اور جسمانی ترقی کرنے [illegible] کاموں [illegible] ہوگی۔
تو وہ ان طفلانہ [illegible] کو بھول جائے گا۔ جو جماعتیں غریبوں کا خون
چوس رہی ہیں ان کے خلاف [illegible] ہوگا۔

پیش بینی

اگر ہندوستان کے مستقبل کی نسبت غور کیا جائے۔ جو ہماری
آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ تو ۹۰ فی صدی حالتوں میں یہ کہنا غلط
نہ ہوگا۔ کہ مستقبل ماضی کے مطابق ہوگا۔ کبھی ایسا [illegible] ہوتا ہے۔ کہ
کوئی خاص واقعہ جو ایک ساتھ تعمیری بھی ہو اور تخریبی بھی جیسا کہ انقلاب
روس تھا۔ ظہور میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ [illegible] کی تحریک اس قسم کی [illegible]

کیا باغی ہندوستان نے وہ اصل انقلاب حاصل کر لیا ہے؟ اس کی بابت
میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی شخص جب تک۔ دوسری گول میز
کانفرنس کے نتائج برآمد نہ ہوں۔ صحیح پیش بینی نہیں کر سکتا۔ میں نے
جو کانگرس کی تحریک کا اندازہ لگایا ہے اس سے خیال سے اگر میں یہ
کہوں تو ناظرین متحیر نہ ہوں گے کہ مستقبل کا انحصار اس امر پر ہے کہ آیا
ایسا دستور اساسی تیار ہو گا۔ یا نہیں جسے کانگرس منظور کرے۔
تین قسم کے امکانات ہیں۔ اول یہ کہ کانگرس یہ خیال کرے کہ دستور
اساسی اس قدر تنگ ہے۔ کہ اسے اس کی مزاحمت کرنی چاہیئے۔ اور
عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم۔ کونسلوں کا بائیکاٹ جاری کر کے وہ تمام ذرائع
جو اس کے اختیار میں ہوں برٹش حکومت کے خاتمے کے لئے کام میں
لائے۔ اس صورت میں عرصہ دراز تک انقلابی کشمکش جاری رہے گی۔
اور ہندوستان سے باہر کے حالات اس پر اثر انداز ہوں گے۔ اگر زراعتی
پیداوار کی قیمتیں دُنیا کی منڈیوں میں جلدی سے چڑھ گئیں۔ تو یہ تحریک
رک جائے گی۔ اور اگر مرکزی یورپ میں انقلاب ہوا تو اسے تقویت
ملے گی۔ اور میرا یقین یہ ہے کہ اگر یہ تحریک ایسے وقت میں شروع ہوئی
جبکہ تجارت کا مسئلہ اس کے پس پشت ہوا۔ تو یہ لازمی طور پر کسانوں
کے انقلاب میں تبدیل ہو جائے گی۔ جس سے ہندوستانی سوسائٹی
کی عمارت اور سلطنت برطانیہ کا تعلق متزلزل ہو جائے گا۔ یہ کشمکش
زیادہ عرصے تک غیر متشددانہ نہیں رہے گی۔ اور اس کی دوسری
صورت یہ ہو سکتی ہے۔ کہ سن فنون کی چالوں کو کام میں لایا جائے اور
دہشت انگیزی اپنی بے رحمی کے ساتھ پھوٹ نکلے۔ اگر ان حالات

ہیں نئے دستور اساسی کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ والیان ریاست اور چند امرا، اور پرانی نسل کے قدامت پسند لوگ برائے نام اس کو عمل میں لائیں گے۔ اور دراصل سول سروس کے فولادی ڈھانچے اور اس کے پیچھے فوجی طاقت پر بھروسہ کیا جائیگا اگر گول کانفرنس میں کسی فریق نے دور اندیشی سے کام نہ لیا۔ تو ہندوستان کو لازمی طور پر اس مرحلے سے گزرنا پڑیگا اور اس کا انجام نہایت تباہی بخش اور افسوسناک ہوگا۔

دوسرا امکان یہ ہے۔ کہ کانفرنس کا نتیجہ نہ تو ایسا اچھا معلوم ہو۔ کہ کانگرس اسے منظور کرلے۔ اور نہ اتنا بُرا کہ وہ اس کی مزاحمت کرسکے۔ تو وہ سول نافرمانی نہیں کرے گی۔ نہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرے گی۔ لیکن وہ عہدے قبول نہیں کرے گی۔ وہ کونسلوں میں غیر ذمہ دار مخالف پارٹی کی حیثیت سے معترضین کے طور پر داخل ہوگی۔ اس صورت میں مستقبل ماضی کے مشابہ ہوگا۔ پارٹیاں مذہب کی بنا پر قائم ہونگی۔ جو عہدے لینا منظور کریں گی۔ اور وہی کچھ ہوگا۔ جو آجکل ہورہا ہے۔ کہ عہدوں اور منصوبوں کے متلاشی لوگ اسی موقع سے فائدہ اٹھایئں گے۔ انہیں اعلےٰ عہدے اور اعزاز و خطابات ملیں گے اور بارسوخ اصحاب ایک دوسرے کے بعد وزارتوں پر قابض ہوں گے۔ اور بڑی شانتی کے ساتھ اپنے نوکر شاہی محکمہ سے ہدایتیں حاصل کیا کریں گے۔ یہ ہندوستانی ہندوستان نہ ہوگا۔ اگرچہ ملازمتوں میں سفید فام لوگوں کی جگہ سیاہ فام لوگ آہستہ آہستہ بھرتی ہوں گے۔ اینگلو انڈین روایات قائم رہیں گی۔ مالی حالت

کو درست رکھنے اور کفائت شعاری کے پُرانے بہانوں کا اعادہ کیا جائیگا - اور عام تعلیم کی اشاعت اور حفظانِ صحت کی ترقی اور مزدوروں کے لئے صحت بخش مکانات تعمیر کرنے کی رفتار ایسی ہی شست رہے گی - ٹیکسوں کا بوجھ غریب کسانوں کے سر سے اٹھا کر زمینداروں پر نہیں رکھا جائے گا - اور لگانِ اراضی کے طریق میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی - مخالف پارٹی غائب ہو جائے گی - لیکن فیڈرل پارلیمنٹ میں والیانِ ریاست کے ورثہ انہیں خاموش کر دیا کریں گے - اور صوبوں کی کونسلوں میں زمینداروں اور صاحبِ جائداد لوگوں کا غلبہ ہوگا - البتہ ایک تبدیلی ہوگی - سرمایہ داروں کے ارادے پورے ہوں گے - بیرونی مال پر محصول بڑھنے سے صنعت ترقی کرے گی - اور غیر صحت بخش قصبات تعمیر ہوتے رہیں گے - اور دیہات کی کوئی خبر نہ لے گا - کانگریس کے ٹکڑے ہو جائیں گے - اس کا معتدل اور قدامت پسند طبقہ ان لوگوں سے جا ملے گا - جو اب بالوقت ہیں اور سرکاری عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا - دوسروں کو سیاسیات میں دلچسپی نہ رہے گی خاص کر اس صورت میں کہ اجناس کی قیمت گراں ہو جانے سے تجارت چمک اٹھے - اگر آزادی غیر اطمینان بخش حد تک ملی - تب بھی اس پر عمل ہوگا - نوجوانوں کے دلوں سے اپنی ذلت کا احساس کم ہو جائے گا - وہ غلامانہ زندگی بسر نہیں کریں گے - اور مغرب سے طبعیات اور اقتصادیات کے سائنس سیکھیں گے - وہ اپنے بزرگوں پر نکتہ چینی کریں گے جب اُن کے دماغ اور اُن کی قوت ارادی پختہ ہو جائے گی - تو وہ ایک

نیا ہندوستان بنانے کے لئے بے صبر ہوں گے۔ ان اثنا میں کانگریس کی باتیاں بازو (خاص کر اس صورت میں کہ مہاتما گاندھی سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر اپنے آشرم میں جا بیٹھیں) اپنا کام کسانوں اور مزدوروں کی پارٹی کی صورت میں کرتا رہے گا۔ اور ہندوستان کے افلاس کے مسئلے کو بعض دفعہ کونسلوں میں بحث چھیڑ کر اور اکثر عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک چلا کر حل کرتا رہیگا کبھی کبھی کسان سرکشی کیا کریں گے۔ اور والیان ریاست کے خلاف بغاوت ہوا کریگی جس کو دبا نا شروع میں بہت آسان ہوگا لیکن آہستہ آہستہ یہ تحریکیں انقلابی صورت اختیار کر لیں گی حتی کہ وقت آنے پر (جبکہ آئندہ کنسرویٹو گورنمنٹ سفیر روس کو لنڈن سے باقاعدہ طور پر نکال دیگی) ماسکو کو ہندوستان سے ہمدردی پیدا ہو گی۔ اس کے آگے عقل کام نہیں کرتی کہ کیا ہوگا۔ تیسرا امکان یہ ہے۔ کہ گول میز کانفرنس ایسا دستور اساسی مرتب کرے۔ جسے کانگرس منظور کر سکے۔ اور اس پر عمل کرے۔ اس کے لئے میں دعا کرتا ہوں۔ میں دلیری کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کی توقع رکھتا ہوں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے۔ کہ غیر ضروری مشکلات کے بغیر اس میں ترمیمیں کرنے کی اجازت ہو۔ ہندوستان کے قرضے میں اور اس کے فوجی اخراجات میں کچھ تخفیف ہونی چاہیئے۔ باشندگان ملک کے حقوق کا اعلان ہونا چاہیئے۔ جو تمام فیڈریشن پر حاوی ہو۔ اور ہائی کورٹوں کو ان پر عمل کرانے کا اختیار ہو۔ اگر ہندوستان کے دوستوں کو کوئی رسوخ

حاصل ہے۔ تو اول وہ برطانوی مدبروں سے یہ مراعات منظور کرانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کے بعد کانگرس پر زور ڈالیں گے کہ اس کو تہ دل سے منظور کرے۔ کیونکہ اگر کشمکش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ مقاومت مجہول تک محدود نہیں رہے گی۔ دہشت انگیزی سے فریقین میں دیوانگی اور بیرحمی ظہور میں آئے گی۔ اور ایسی نفرت کی یاد اپنے پیچھے چھوڑ جائے گی جو نسلوں تک ہندوستان کے لیئے ایک لعنت ہوگی۔ جس طرح کہ غدر کی بعض یادگاریں ان کے قرب سے ہر ایک گزرنے والے کے دل کو زہر آلود کرتی ہیں ان مطالبات کا ادھورا منظور کیا جانا بھی کسی قدر اچھا ہوگا۔ بہر صورت اگر کوئی دُور اندیشی کی نظر سے دیکھے۔ تو آخری نتیجہ ہندوستان نہیں بلکہ ہندوستان ہوگا۔ اگر غیر مکمل دستور اساسی کو بھی منظور کر لیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ مسئلے کے تمام ضروری پہلو حل ہو جائیں گے۔ ایک ناقص دستور آئین پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ایک زبردست پارٹی جس کی پُشت پر عام رائے ہو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے ہندوستان میں اس قسم کی ایک ہی پارٹی ہے اس کی طاقت کا راز یہ ہے کہ وہ عوام الناس کے جذبات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اور انہیں سرگرمی اور برداشت صعوبت کے لئے آمادہ کر سکتی ہے۔ اور ان سے مدد لے سکتی ہے۔ اگر اس پارٹی کے لیڈر پہلی دفعہ عہدے منظور کریں اور وزارتیں قبول کریں۔

تو یہ خود ان کا قصور ہوگا۔ اگر ان کے ماتحت انگریز افسر انہیں
اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ انہیں وہ بات حاصل
ہوگی۔ جو ابھی تک کسی ہندوستانی وزیر کو حاصل نہیں ہوئی
یعنی ان کی پشت پر بہت بڑی پارٹی ہوگی۔ وائسرائے اور
گورنروں کو جو کونسلوں کی پاس کردہ تجاویز مسترد کرنے کا اختیار
حاصل ہے اور کاغذ پر یہ اختیار بہت زبردست نظر آتا ہے۔
اس سے اس وزارت کے خلاف بہت کم کام لیا جائے گا۔
جن کی حمایت پر عام رائے موجود ہوگی۔ ایک ناقص دستور
اساسی کے اندر بھی ایک زبردست پارٹی جس کے ہاتھ میں
انتظام کی مشنری ہو۔ بہت کچھ کر سکتی ہے وہ زمینوں میں
مدفون یا زیورات کی صورت میں منجمد روپے کو تعمیری
مقاصد کے لئے نکلوا سکتی ہے۔ وہ زراعت کو ترقی دے
سکتی ہے۔ دیہاتی صنعتیں قائم کر سکتی ہے۔ اور صحت اور مکانات
کا معیار بلند کر سکتی ہے۔ کوئی بدیشی گورنمنٹ یہ کام نہیں کر سکتی
اور نہ کوئی ہندوستانی گورنمنٹ کر سکتی ہے۔ جو پرانے نوکر
شاہی طریقوں پر چلتی ہو۔ یہ تو صرف ایسی گورنمنٹ کر سکتی ہے
جو ہندوستان بھر میں والنٹیروں کے لشکروں پر کنٹرول کرتی
ہو۔ وہ قوانین وضع کریگی۔ کسانوں کو منظم کرے گی۔ دیہاتی
پنچایتوں میں زندگی اور حرکت پیدا کر دے گی اور انہیں کھلے
عام کام کرنا چاہئے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ کانگریس یہ کام کرنے
کی قابلیت رکھتی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہے کہ اور کسی پارٹی

میں یہ قابلیت نہیں۔ کانگریس کو بہت دُور چلنے سے پہلے معلوم ہو جائے گا۔ کہ اسے ان طاقتوں سے جنگ کرنی چاہئے جو غریبوں کا خون چوستی ہیں اور جو خود اس کے اندر شامل ہیں بہت سے زمیندار اور سیٹھ اور کارخانوں کے مالک اس سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور ان کے نکل جانے سے کانگریس کو خوشی حاصل ہو گی۔ کیونکہ جب تک یہ لوگ ہندوستان کی فصلوں کو کھاتے رہیں گے۔ ہندوستان ایسا ہی پسماندہ ایسا ہی غریب اور ایسا ہی لاغر رہے گا۔ شمالی ہندوستان میں جب تک زمینداری سسٹم کا خاتمہ نہ ہو۔ کسانوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب تک ضعیف الاعتقادی اور دقیانوسی روایات پر حملہ نہ کیا جائے مفلسی کو دُور کرنے کی توقع نہ ہو گی۔ ہندوستانی قوم کو آزادی کے پہلے دس سال میں مجلسی کشمکش کرنی ہو گی۔ کیونکہ ایک باغی ہندوستان ہے جو اپنے ہتھیار نہ ڈالے گا۔ جب تک آزاد شدہ کھیتوں میں کسان اپنی فصل کو جو اس نے پیدا کی ہے اپنی بیوی اور بچوں کے لئے اپنے گھر میں محفوظ نہ رکھ سکے گا۔

قومی ہیروز کی سوانح عمریاں

۱۔ میزنی :۔ از لالہ لاجپت رائے ۔ جس نے اٹلی کو آزادی دلائی قیمت ۱۲ار

۲۔ گیری بالڈی } یہ بھی اٹلی کا ہیرو ہو گزرا ہے ۔ جس نے اپنا جیون قوم اور ملک کے ارپن کیا قیمت ۱۰ار

۳۔ لینن } رُوس کی خود مختار زبردست اور جابر سلطنت کو پلٹنے والے بالشوازم کے بانی لینن کے دلچسپ حالات قیمت ۴ار

۴۔ مزدوروں کا پیغمبر } یعنی کارل مارکس کی سوانح عمری از لالہ ہردیال قیمت ۴ار

۵۔ بھگوان تلک } قوم پرستوں کے بے تاج بادشاہ کی زندگی کے پر سبق حالات قیمت ۸ار

۶۔ نپولین } فرانس کے بے خوف جنرل بے نظیر عادل و شہنشاہ ۔ ناممکن کو ممکن بنانے والے کے سبق آموز حالات قیمت ۱۰ار

۷۔ تلاش حق } مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح عمری دو حصوں میں قیمت :۔ ۳

پبلشرز
لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

زمانہ حال کی بہترین سیاسی تصنیفات

۱۔ **زمانہ حال کی غلامی اور اس کے اسباب:** مصنفہ لیوکونٹ ٹالسٹائی [illegible] قیمت [illegible]

۲۔ **سوویٹ روس** [illegible] پنڈت جواہر لال [illegible] پنڈت جی کے چشم دید حالات [illegible] گزشتہ [illegible] حالات [illegible] قیمت [illegible]

۳۔ **ہندوستان اور یورپ کی پولیٹیکل اکانومی:** از [illegible] بہترین اور مکمل کتاب۔ قومی کالج نے اسے بطور کورس کے منظور [illegible] ہندوستان کی اقتصادیات کے متعلق اور [illegible] معلومات [illegible] قیمت [illegible]

۴۔ **[illegible] آزادی** [illegible] ملک کے [illegible] نظریہ [illegible] قیمت [illegible]

۵۔ **انگریزی تعلیم اور ہندوستانی قومیت کا دیوالہ:** از لالہ ہردیال [illegible] کتاب کا نام اور اس کا مصنف ہی کتاب کے مضمون [illegible] قیمت [illegible]

۶۔ [illegible] لالہ ہردیال [illegible] خوشامدی [illegible]

[illegible] پبلشرز تاجران کتب [illegible] لاہور